نوائے زبان

بیادِ علامہ اقبال

اپریل ۲۰۰۸ء

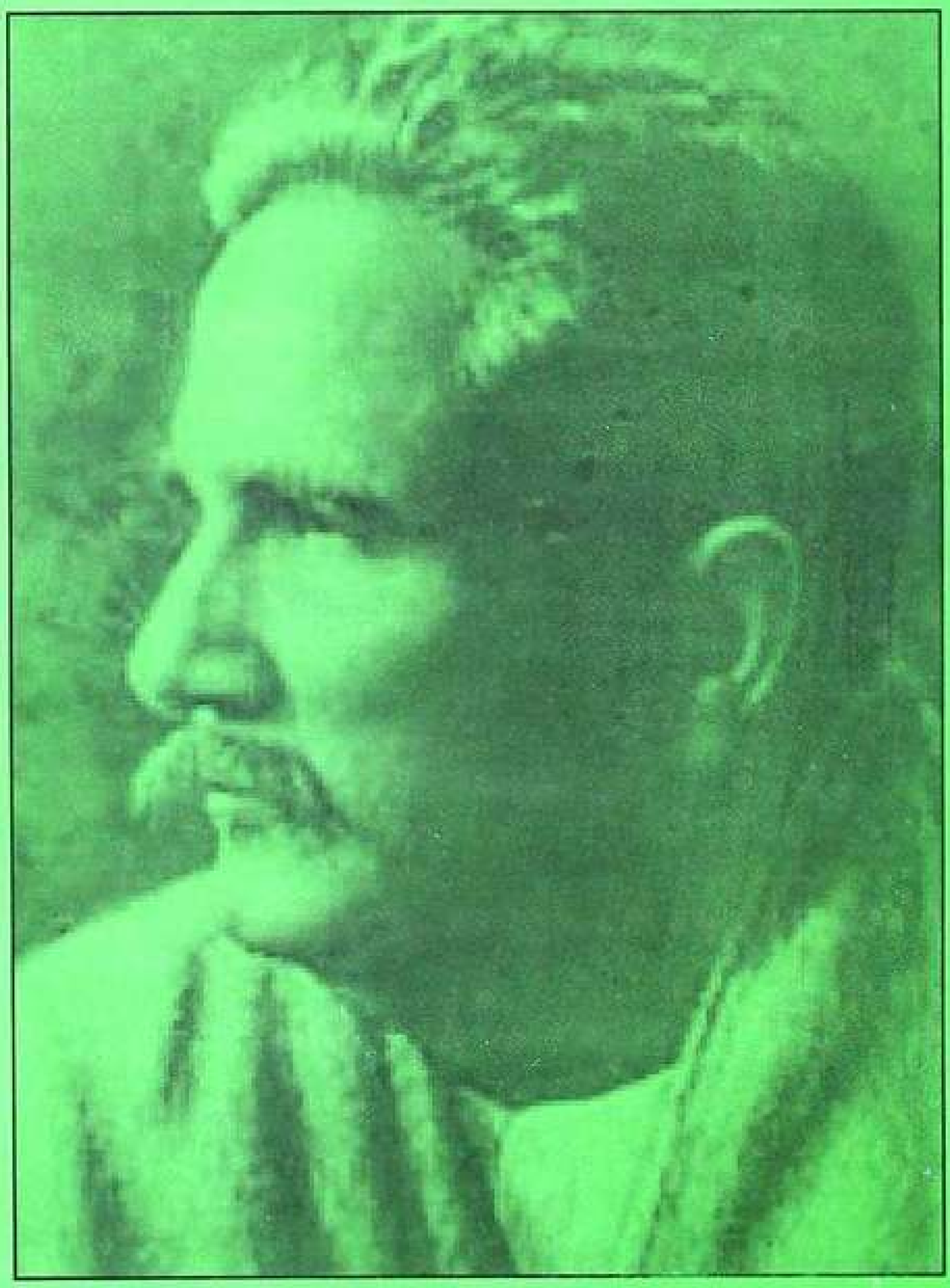

سرسید احمد خاں، حالات وافکار

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو، سرسید احمد خاں کے شاگرد خصوصی تھے۔ اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے سرسید احمد خاں کو چلتے پھرتے تاریخی، علمی کارنامے انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے اس سے نئی نسل کو بھی اُسی انداز میں آگاہ کریں۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی باقیات کو دہلی سے لاکر کراچی میں مجتمع کیا اور انجمن کے بے جان اور ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونکی۔

۱۹۴۹ء میں اردو کالج قائم کیا۔ بعد میں اردو کالج کے پرنسپل اور اُن کے نامزد کیے ہوئے شرکائے کار نے بابائے اردو کے خلاف جو سازشیں اور غیر اخلاقی وغیر انسانی برتاؤ کیا وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بقلم خود اس کا تفصیلی احوال بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قومی زبان، اپریل ۲۰۰۸ء، جلد ۸۰، شمارہ ۴

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدّین عالیؔ

مُدیر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بدلِ اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۰ روپے

سالانہ صرف رجسٹری سے ۲۳۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

اداریہ		۳
اقبال اور جامی	وحید الرحمٰن خان	۵
اقبال کا تصورِ عظمتِ انسانی	اعظم نوید	۱۱
اقبال شاعر رنگ و بو	رفعت سروش	۱۹
علامہ اقبال اور جدید اردو غزل	جاوید منظر	۳۰
اقبال — ایک نئی آواز	افتخار اجمل شاہین	۳۴
علامہ اقبال عظیم شاعر، عظیم مفکر	نسیم انجم	۳۸
اقبال کا فلسفۂ عقل و عشق	ارم سحر آفتاب	۴۲
اقبال جدید اردو نظم کا پیش رو	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰
فائدہ (روسی کہانی)	مائخیل زوشینکوف/مترجم: م-ا-خ	۵۵
ہمارے قاضی عبدالستار صاحب	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۵۸
جمیل الدین عالی کا نظیہ "انسان"... ایک تاثر	حسن ظہیر	۷۱
رفتار ادب		۷۴
گرد و پیش		۸۵

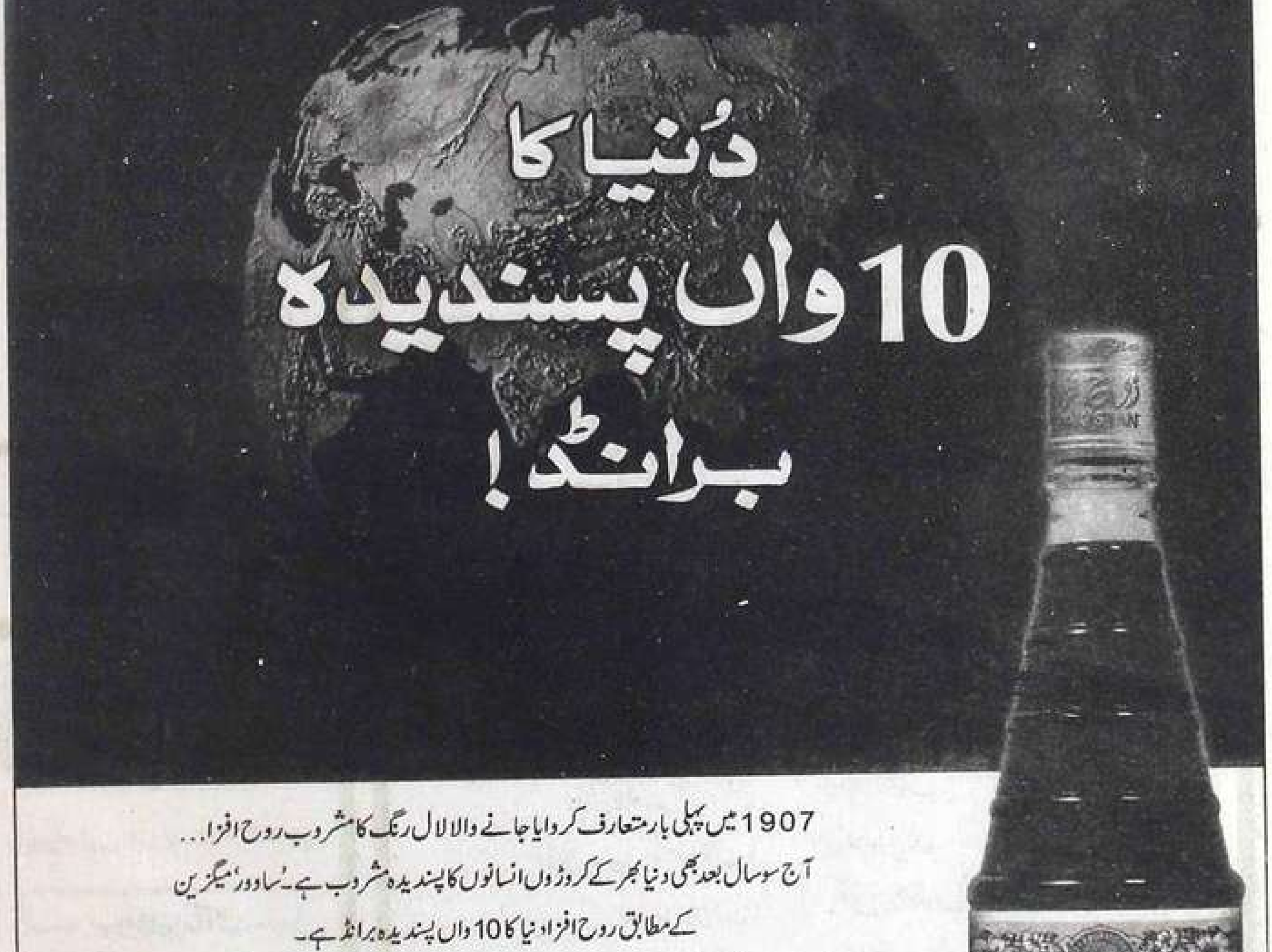

خوردونوش سے متعلق مشہور امریکی میگزین 'ساوور' کہتا ہے:
جنّت نظیر تازگی کے لئے رُوح افزا
دُنیا کا
10 واں پسندیدہ
برانڈ!
SHARBAT
ROOH AFZA
1907 میں پہلی بار متعارف کروایا جانے والا لال رنگ کا مشروب روح افزا...
آج سو سال بعد بھی دنیا بھر کے کروڑوں انسانوں کا پسندیدہ مشروب ہے۔ 'ساوور' میگزین
کے مطابق روح افزا دنیا کا 10 واں پسندیدہ برانڈ ہے۔
آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں... گلاب، کیوڑہ، منتخب جڑی بوٹیوں، فرحت بخش پھلوں و پھولوں
سے تیار کردہ روح افزا سال بھر آپ کی روح کو تازگی اور جسم کو توانائی فراہم کرتا ہے۔
ماخذ:- ساوور میگزین امریکہ (نمبر 99-2007)
SGS
ہمدرد
SGS
ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
ISO 9001: 2000 & ISO 22000: 2005 CERTIFIED
Tel: (009221) 6616001-4, Email: hamdard@khi.paknet.com.pk, www.hamdard.com.pk
Blitz DDB

اداریہ

علامہ اقبال جو تصورِ حیات پیش کرتے ہیں اس کو ہم بلاشبہ جامع نصب العین کا نام دے سکتے ہیں۔ جامع اس لحاظ سے کہ اس میں زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ ایک جامع نصب العین کے لیے انھوں نے بلاشبہ قرآن مجید اور آنحضرت محمدؐ کی زندگی سے تحریک حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے تجربات، مشاہدات نیز ان کے مغرب کی معاشرت کے گہرے مطالعے اور مغربی مفکرین کے خیالات جن میں نطشے وغیرہ شامل ہیں، ان سب نے مل کر بھی ان کے جامع نصب العین کے تصورات کو مہمیز لگائی تھی، مگر واضح رہے نطشے اور دوسرے مغربی مفکرین کے منفی خیالات کو انھوں نے رد کیا تھا، اس لیے کہ وہ برصغیر میں ایسی فضا کے قیام کے حامی تھے جس میں لوگ ذہنی غلامی کی لعنت اور بے عملی سے نجات حاصل کرتے۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے خودی کے فلسفے کو اس دلنشیں انداز سے پیش کیا کہ اس سے برصغیر کے مفکرین، ادیب، نقاد اور سماجی مصلحین سب ہی متاثر ہوئے اور یہ تاثر عام ہوا کہ اس فلسفے کی روشنی میں انسان کی خلاّقانہ صلاحیتیں بیدار ہو سکتی ہیں اور اس میں سعیٔ پیہم کا جذبہ بیدار ہو سکتا ہے، دراصل علامہ چاہتے تھے کہ وہ دنیا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لائے، مظلوموں کی دادرسی کرے اور مثبت و تعمیری فکر کو اپنائے، منفی و تخریبی افکار سے علاحدگی اختیار کرے اور امن و انصاف کے لیے کام کرے۔

ان کی شاعری نغمگی، فنی و فکری بلند آہنگی، جمالیاتی حسن، رعنائیِ خیال سے متصف ہے۔ ان کا کلام قنوطیت و مایوسی کو رد کرتے ہوئے ہمیں امید کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال زندہ ہی اس لیے ہیں کہ وہ ہمیں حوصلہ دیتے ہیں، ان کی شاعری پرآشوب دور کی تاریکی میں شمع کی روشنی کی مانند ہے جس کے ذریعہ ہم خوشی و مسرت کے راستے تلاش کر سکتے ہیں۔

انجمن کی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۲۔سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۳۔افکار عالیہ	خان رشید/قاضی قیصر الاسلام	130/-
۴۔ملت اسلامیہ	علی نواز میمن/صفوت قدوائی	250/-
۵۔غالب کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	100/-
۶۔پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۷۔انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۸۔منتشر یادیں	نورالحسن جعفری	150/-
۹۔اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۰۔غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	120/-
۱۱۔تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۱۲۔اشاریۂ اردو (جلد دوم)	مصباح العثمان	100/-
۱۳۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)	سید ہاشمی فرید آبادی	250/-
۱۴۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	300/-
۱۵۔غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۶۔غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۷۔اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۱۸۔مقالات مرزا محمد سعید	شیما مجید	125/-
۱۹۔جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-
۲۰۔غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	350/-
۲۱۔نقش ہائے رنگ رنگ	مترجم: ڈاکٹر صابر آفاقی	250/-
۲۲۔جدید اور مابعد جدید تنقید	ناصر عباس نیر	300/-
۲۳۔مجنوں گورکھپوری حیات و فن	ڈاکٹر عبدالستار نیازی	400/-
۲۴۔ممتاز حسن احوال و آثار	فرزانہ ناہید گیلانی	225/-
۲۵۔پاکستان میں اردو دوہے کی روایت	کنول ظہیر	250/-
۲۶۔اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار	ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز	350/-
۲۷۔متنی تنقید	ڈاکٹر خلیق انجم	300/-
۲۸۔حرفے چند (جلد چہارم)	جمیل الدین عالی	250/-
۲۹۔ندائے دوست	شباہت علی خان	175/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی۔۷۵۳۰۰

وحید الرحمٰن خان

اقبال اور جامی

کلام اقبال میں جن فارسی شعرا کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں ایک نام جامی کا بھی ہے۔ جامی کا پورا نام نور الدین عبدالرحمٰن تھا۔ وہ نظام الدین احمد دشتی کے فرزند تھے اور شمس الدین محمد دشتی اصفہانی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ جامی جام کے مقام پر ۸۱۷ھ بمطابق ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ جامی کا تخلص ان کے جائے ولادت کی نسبت سے ہے اور اس کی ایک نسبت شیخ الاسلام الناسقی جامی سے بھی ہے جس کی طرف جامی نے اپنے شعروں میں یوں اشارہ کیا ہے:

مولدم جام و رشحۂ قلمم
جرعۂ ای جام شیخ الاسلامی است
لاجرم در جریدۂ اشعار
بدو معنی تخلصم جامی است

جامی بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والدِ گرامی سے حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے نامور علمی و دینی ادارے مدرسۂ نظامیہ ہرات میں داخل ہوئے۔ حصول علم کے لیے سمرقند بھی گئے۔ اس تعلیمی سفر میں خواجہ سمرقندی، محمد جاجیرمی اور فتح اللہ تبریزی سے کسب فیض کیا۔ اس دوران میں ان کا دلی میلان تصوف کی جانب ہوگیا اور وہ سعد الدین کاشغری، خواجہ علی سمرقندی اور قاضی زادہ رومی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ جامی نے شعرگوئی کے ساتھ ساتھ دین، ادب، تاریخ، حکمت اور تصوّف میں کمال پیدا کیا۔ جامی ایک کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر ناتمام (سورہ بقرہ)
(۲) شواہد النبوت (سیرت مبارکہ)
(۳) اشعۃ اللمعات (شرح لمعات عراقی)
(۴) لوامع (شرح قصیدۂ ثانیہ ابن فارض)
(۵) شرح بعض اشعار فارضیہ
(۶) شرح رباعیات
(۷) نقد النصوص (شرح فصوص الحکم)
(۸) لوائح (رباعیات مبنی بر مسئلہ وحدت الوجود)

(۹) شرح بیتے چند از مثنوی معنوی
(۱۰) شرح حدیث ابی ذر غفاری
(۱۱) رسالی فی الوجود
(۱۲) ترجمہ وتشریح اربعین حدیث
(۱۳) رسالہ تہلیلیہ (تشریح کلمۂ توحید)
(۱۴) مناقب خواجہ عبداللہ انصاری
(۱۵) رسالہ التحقیق مذہب صوفی (متکلم وحکیم)
(۱۶) رسالہ مبنی برسوال وجواب ہندوستان
(۱۷) رسالہ مناسک حج
(۱۸) ہفت اورنگ (مجموعہ مثنویات)
(۱۹) رسالہ درعلم قافیہ
(۲۰) دیوانِ جامی (دیوان اوّل)
(۲۱) دیوانِ جامی (دیوانی ثانی)
(۲۲) دیوانِ جامی (دیوان ثالث)
(۲۳) بہارستان (بطرز گلستان سعدی)
(۲۴) رسالۂ کبیرہ درفن معمہ
(۲۵) رسالہ صغیرہ درفن معمہ
(۲۶) رسالہ متوسط درفن معمہ
(۲۷) رسالہ اصغر درفن معمہ
(۲۸) رسالہ درفن عروض
(۲۹) شرح بعض ابیات مثنوی معنوی
(۳۰) شرح فصوص الحکم
(۳۱) منشائتِ جامی
(۳۲) فوائد الضیائیہ فی شرح کافیہ
(۳۳) رسالہ طریقِ صوفیاں
(۳۴) نفحات الانس
(۳۵) شرح چند ابیات امیر خسرو دہلوی
(۳۶) مناقب مولوی معنوی
(۳۷) رسالہ درفن موسیقی
(۳۸) سخنان خواجہ پارسا

''نفحات الانس'' جو صوفیا کا تذکرہ ہے، جامی کا اہم ترین علمی کارنامہ ہے۔ جامی کی شاعری میں شعرائے سلف کی سی تاثیر ہے۔ خصوصاً ان کی غزل پر سعدی، حافظ اور امیر خسرو کے اثرات ہیں۔ انھوں نے شاعری میں مضامینِ تصوف کو نہایت لطیف اور دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے۔ جامی حصولِ مال ومتاع سے بے نیاز تھے اس لیے قصیدے کی جانب انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے برعکس انھوں نے منعم حقیقی کی مدح سرائی کی۔ ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری نہایت اثر آفرین ہے۔ انھیں رسول اکرمؐ سے حد درجہ محبت تھی اور مدحتِ پیغمبر کرتے ہوئے ان کے ہاں وارفتگی اور شیفتگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے جامی کے عشقِ رسول کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جامی نے ۸۹۸ھ بمطابق ۱۴۹۲ء میں ہرات میں وفات پائی۔ (مقدمہ کلیاتِ جامی)

مولانا جامی کو حضور اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے حد درجہ عشق تھا اور ان کی شاعری میں اس جذبے کی خوشبو رچی بسی ہے۔ جامی کے کلام میں حضورؐ سے والہانہ عقیدت کا اظہار نمایاں ہے۔ یہی خصوصیت کلامِ اقبال میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ''جامی نے عشقِ رسولؐ میں بہت پرسوز شعر کہے ہیں۔ یہ مضمون جامی اور اقبال دونوں میں مشترک ہے۔'' (اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۴۵۲)

جامی کی طرح اقبال کے کلام سے بھی آنحضرتؐ سے عقیدت اور شیفتگی ظاہر ہوتی ہے۔ عرشی امرت سری نے دونوں شاعروں کی

اس قدرِ مشترک میں ایک فرق بیان کیا ہے جو دراصل جذبے کے دو مختلف رنگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ عرشی کے مطابق:

''جامی و اقبال میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ جامی کا قدم اپنی داخلی دنیا سے باہر نہیں نکلا۔ وہ پیغمبرؐ کے حضور تنہا جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ انھیں محبوبؐ کے سوا کسی سے واسطہ نہیں لیکن اقبال پوری امت کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں، حضور کے دروازے پر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کی دیوانگی میں ادب ملحوظ رہتا ہے اور فریاد میں پوری قوم کی ترجمانی پیش نظر رہتی ہے۔''

(اقبال۔ پیامبر امید، ص ۱۱۸)

اقبال، جامی کو ایک شاعر سے زیادہ ایک عاشق کے طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ایک ایسا عاشق جس کا دل محبوب عالمؐ کی یاد میں ہمہ وقت دھڑکتا ہے۔ سید عبداللہ نے اس حوالے سے لکھا ہے:

''گمان غالب یہ ہے کہ علامہ کو جامی کی غزل میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کی صوفیانہ نظم و نثر انھیں مرغوب تھی۔ محض بہ طورِ شاعران کی رائے یہ ہے:

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد انوری و ہزار جامی''

(بحث و نظر، ص ۲۸۷)

اقبال نے اپنی شاعری میں دو تین مقامات پر ستائشی انداز میں مولانا جامی کا براہِ راست تذکرہ کیا ہے۔ ''اسرارِ خودی'' میں در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد'' کے عنوان کے تحت جامی کے ایک شعر کو تضمین کرتے ہوئے جامی کے جذبۂ عشق کو سراہا گیا ہے:

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم
شعر لب ریزِ معانی گفتہ است
در ثنائے خواجہ گوہر سُفتہ است
''نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست''

(اسرارِ خودی، ص ۲۱)

اقبال نے جامی کو عشق کی علامت کے طور پر بھی دیکھا ہے، عشق جو سوز، تڑپ اور تپش جیسی کیفیات کا آئینہ دار ہے اور عقل اور

منطق سے بالاتر ہے۔ ذیل میں اقبال کی دو بیتیاں نقل کی جارہی ہیں جن میں ان جذبات کا اظہار ملتا ہے:

گہے شعرِ عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے سارہانم

(ارمغانِ حجاز، ص ۲۸)

مرا از منطق آید بوے خامی
دلیل او دلیلِ ناتمامی
بہ رُومیم بستہ درہا را کشاید
دو بیت از پیرِ رومی یا ز جامی

(ارمغانِ حجاز، ص ۱۳۲)

علامہ کی نثری تحریروں میں بھی مولانا جامی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اقبال نے مولانا گرامی کے نام جو خط تحریر کیے ہیں، ان میں دو تین بار جامی کا ذکر آیا ہے۔ یہ ذکر ہم ذوقی، ہم سخنی اور مشورۂ سخن کے تحت آیا ہے۔ ایک خط میں اقبال رقم طراز ہیں:

''کل مولانا جامی کا ایک نہایت مزے دار مطلع نظر پڑا، یعنی:

آن کہ از حلقۂ زرگوش گران است او را
چہ غم از نالۂ خونین جگران است او را

بہت فکر کی کہ ایسا مطلع نکل سکے مگر مندرجہ ذیل ملاحظہ فرمایئے اور اپنے مشورے سے بھی آگاہ کیجیے:

باز گوید صنم ار تاب مقالش بخشند
گلہ ہائے کہ ز ہندو پسران است او را
یارب از غارتِ گل بردلِ نرگس چہ گذشت
دست بے طاقت و چشم نگران است او را''

(کلیاتِ مکاتیبِ قبال، ص ۶۴۵)

اسی طرح ایک خط میں شعر کی سند کے معاملے میں لکھتے ہیں:

''مولانا جامی کا شعر آپ نے خوب نکالا۔''

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص ۳۳۱)

ایک اور خط میں جامی کا ذکر یوں ہوا ہے:

''مولانا جامی کی غزل پر جو دو شعر آپ نے لکھے ہیں، لاجواب ہیں اور بالخصوص آں یک اندیش الخ سبحان اللہ!''

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص۴۴۵، ۴۴۶)

مظفر حسین برنی کے مطابق گرامی کا مکمل شعر یوں ہے:

گرد ازنیم نظرِ خیبرِ کفرم بدونیم
آں یک اندیش کہ تیغِ دو زبانست او را

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص۴۴۶)

برنی نے مزید لکھا ہے: ''یہ پوری منقبت دیوانِ گرامی میں موجود ہے۔'' (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص۴۴۶)

یہاں برنی سے معمولی سے فروگزاشت ہوئی ہے، یہ منقبت نہیں، نعت ہے جس کا مطلع یہ ہے:

آنکہ راہے نہ نہاں خانۂ جانست او را
بے نشانست و بہرہ ذرّہ نشانست او را

(دیوانِ گرامی، ص۲)

اقبال اور گرامی میں ذوقِ شعر کی قدر مشترک ہے۔ دونوں کے درمیان مشورۂ سخن اور تبادلۂ اشعار بھی ہوتا تھا۔ مکاتیب میں اسی ذہنی روش کے تحت جامی کو یاد کیا گیا ہے۔

جامی اور اقبال کے کلام میں جہاں عشقِ رسولؐ ایک مشترک قدر کے طور پر نمایاں ہوتی ہے وہاں چند مقامات پر ایک اور قدر مشترک ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ اشتراک فنی سطح پر قائم ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے جامی کی چند ایسی غزلوں کی نشان دہی کی ہے جن کی زمینوں میں اقبال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ (اقبال اور فارسی شعرا، ص۱۹۶ تا ۱۹۹) ذیل میں یہ شعری اشتراکات درج کیے جا رہے ہیں:

جامی: اصبحت زائراً لک یا شحنۃ النجف — بہر نثار مقدم تو نقد جان بکف

(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۲۵)

اقبال: میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف — آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

(بالِ جبریل، ص۳۹)

جامی: طرفِ باغ و لبِ جوی و لبِ جامست اینجا ساقیا خیز کہ پرہیز حرامست اینجا
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۸۵)

اقبال: ہست این میکدہ و دعوتِ عام است اینجا قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا
(پیامِ مشرق، ص۱۲۴)

جامی: ریزم ز مژہ کوکب بی ماہِ رخت شبہا تاریک شمی دارم با این ہمہ کوکب ہا
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۶۷)

اقبال: من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا شب ہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکب ہا
(زبورِ عجم، ص۱۱۷)

جامی: من و فکر تو چہ بینم بہ جمالِ دگران ہم خیالِ تو مرا بہ ز وصالِ دگران
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۳۹۹)

اقبال: مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگران از دل و دیدہ فروشوی خیال دگران
(پیامِ مشرق، ص۱۷۴)

واضح رہے کہ جامی سے قبل کہ فارسی شعرا نے بھی ان زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے جامی کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا تھا جس کے اثرات ان کے اپنے کلام سے ظاہر ہیں۔

کتابیات:

(۱) احسن، عبدالشکور، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء
(۲) جامی، عبدالرحمٰن، کلیات دیوانِ جامی، تہران، انتشاراتِ ہدایت، دیماہ ۶۲ (جامی کی زندگی اور شاعری کے بارے میں معلومات شمس صدیقی بریلوی کے مقدمے سے حاصل کی گئی ہیں۔
(۳) سید عبداللہ، بحث ونظر، م ن، س ن۔
(۴) عرشی امرتسری، علامہ، اقبال۔ پیامبر امید (مرتبہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا) لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء۔
(۵) محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔
(۶) محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۹۰ء۔
(۷) محمد ریاض، ڈاکٹر، اقبال اور فارسی شعرا، لاہور، اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۷۷ء
(۸) مظفر حسین برنی، سید (مرتب) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد:۲، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء

اعظم نوید

اقبال کا تصورِ عظمتِ انسانی

دنیا کے کئی مفکرین نے انسانی عظمت کی باتیں کی ہیں اور ایک برتر انسان کے بارے میں سوچا ہے جو اپنے قویٰ کے اعتبار سے یا اپنی سیرت و کردار اخلاق کے اعتبار سے عام انسانوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اخلاق و کردار کے اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز اور انسانوں کے لیے نمونہ بتایا گیا ہے۔ اقبال جیسے عاشق رسول صلعم کو اس بات سے کیسے کوئی اختلاف ہو سکتا تھا، اس کے باوجود جس طرح ابن عربی، عبدالکریم الجیلی، رومی یا جرمن مفکر نٹشے نے برتر انسان کا تصور دیا ہے، اقبال بھی اپنے فلسفہ خودی کے ضمن میں جہاں عظمت انسانی کی بات کرتے ہیں وہاں وہ انسان کے روشن مستقبل کے لیے ایک برتر اور قوی انسان کا ذکر کرتے ہیں۔ جو نائب خدا بننے کا اہل ہو اور انسان کی بگڑی بنا سکے۔ یہ انسان مہدی ہو، فوق البشر، مردِ مومن، مردِ مسلمان یا مردِ کامل، اقبال کے نظامِ فکر میں وہ بہر حال خدا کی مخلوق اور اس کا مطیع ہوگا۔

ابن عربی نے اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ عقائد کی روح سے انسانِ کامل کا ایک تصور دیا تھا جو رومی اور عبدالکریم الجیلی کے ہاں بھی ملتا ہے۔ جرمن مفکر نٹشے نے، جس کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا، ایک ملحد فوق البشر کا تصور دیا۔ جسے بعض لوگ اقبال کے انسانِ کامل کے تصور سے مربوط کرتے رہے ہیں۔ اقبال کے مردِ مومن کو مردِ یقین یا جو بھی نام دیں، اس کی بنیادی صفات یہ ہیں کہ وہ اطاعت اور ضبطِ نفس کی پابندیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

اقبال اس عصر میں عظمت انسانی کے ایک زبردست نقیب رہے ہیں۔ وہ خدا کی مخلوق میں سب سے اشرف تخلیق انسان کو ہی قرار دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اپنے اس شرف کو بھول جائے تو پست سے پست تر مقام میں بھی گر سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات کے تحت انسان کا مقام و مرتبہ اگر اسے احساس ہو تو بے انتہا بلند ہے۔ مثنوی اسرار خودی میں اقبال مرد کامل کو نائب حق اور کئی دوسرے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

پیامِ مشرق میں دو نظمیں عظمت انسانی کے بارے میں ہیں ایک خدا اور انسان کے درمیان گفتگو ہے اور دوسری آدم کی تخلیق کے سلسلے میں:

اقبال فرماتے ہیں کہ:

''دنیا کی یہ ساری رونق اور گہما گہمی حضرت انسان کے وجود سے ہی ہے، اس لیے انسانی معاشرے کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو برتر اور بہتر صورت میں پروان چڑھنے کی تمام ضروری سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی جائیں۔''(۱)

روزھا روشن زغو غائے حیات
نے آذاں نورے کہ بینی در جہات
(جاوید نامہ)

انسانی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کی فطرت کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہرایا۔ **فطرة الله التی فطر الناس علیها**۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں نے انسان کو جتنا ذلیل سمجھا، اسلام نے اتنا ہی اس کے رتبے کو بلند کیا اور اس کو اختیار دیا کہ اپنے فکر و عمل سے حالات و حقائق میں تغیر کرے اور جو کچھ موجود ہے اس کو اس میں ڈھال سکے جو ہونا چاہیے۔ اسلام نے انسان کے تصور و ارادے کو آزاد چھوڑ دیا تا کہ وہ عالم رنگ و بو کے ماورا جو چمن اور آشیانے ہیں ان کا رازداں بن سکے۔''(۲)

اقبال کے نزدیک کسی تہذیب کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اس میں انسانی فضیلت کو تسلیم کیا جائے اور اس میں افراد ذریعہ نہ ہوں بلکہ مقصود ہوں۔ اس واسطے کہ انسان کا مقام ساری کائنات سے بلند ہے۔

اقبال کے ہاں ''انسانِ کامل'' کے متعلق جابجا ارشارے ملتے ہیں۔ انھیں صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اسلامی تعلیم اور اسلامی مفکروں کے خیالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اسلام نے انسانی کمال اور فضیلت کے اصول کو تسلیم کیا اور اس کی ذات کو تخلیق اقدار کا سرچشمہ ٹھہرایا۔ چوں کہ انسان کائناتِ ہستی کا بلند ترین مظہر تھا۔ اس لیے اس کو زمین پر نیابتِ الٰہی کی ذمے داری سونپی گئی۔ دراصل اقبال کا ''انسانِ کامل'' کا تصور اس کے خلافتِ الٰہیہ کے اسلامی تصور پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اسلامی مفکروں کے ذہنی روایات کے سرمائے سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے۔(۳)

اقبال کا وہ گم شدہ انسان جسے وہ ''انسانِ کامل'' سے تعبیر کرتا ہے کہاں ہے؟ اور کون ہے مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم میں سے اکثر اس سوال کا جواب سن کر چونک پڑیں گے جب کہ ان کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اقبال کا ''انسان کامل'' ایک ''سچا مسلم'' ہے اور ان کا یہ چونکنا بڑی حد تک بجا ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ جن کی نگاہوں کے سامنے لفظ مسلم کے بعد ایک خشک جامد اور بجھی بجھی زندگی گزارنے والے انسان کی تصویر پھر جاتی ہے، وہ کبھی بھی اقبال کے انسان کامل کا تصور کسی ''مسلم'' سے نہیں کر سکتے، لیکن اقبال کا مردِ مومن دراصل قرآنی نظریہ کا انسان کامل ہی ہے۔(۴)

محی الدین ابنِ عربی اور عبدالکریم الجیلی نے انسانِ کامل کے تصور پر بحث کی ہے۔ جیلی نے اپنی فکر انگیز تصنیف ''الانسان الکامل فی معرفته الا و اخر والاوائل'' میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے۔ انسانی ہستی ذاتِ باری کی خارجی شکل ہے۔ بغیر انسانی وجود کے ذات مطلق اور کائنات فطرت میں رابطہ نہیں قائم ہو سکتا۔

انسان ان دونوں وحدتوں میں اتصالی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ ''انسانِ کامل'' تخلیق کائنات کا اصلی مقصد ہے۔ ذاتِ انسانی کے توسط سے ذاتِ مطلق خود اپنا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ سوائے انسان کے کسی اور مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ صفاتِ الیہ کی مظہر بن سکے۔ حضرت رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ''انسان کامل'' کا اعلیٰ ترین نمونہ دنیا کے لیے پیش کر دیا۔ آپ کی سیرت پاک انسان کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ جس کی روشنی میں چل کر وہ حیات کے مراتب عالیہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ حقیقتِ محمدی ہر زمانے میں مختلف ناموں اور لباسوں کے تحت جلوہ گر تی ہے اور اقدار حیات کا قوی اور گہرا اثبات اس کی ذات سے ہوتا رہتا ہے۔ اگر اقدار حیات کی تخلیق کا سلسلہ جاری نہ رہے تو تمدن سکونی اور جامد ہو جائے۔

عبدالکریم جیلی کا عقیدہ تھا کہ باوجود نیابت الٰہی کی اہلیت رکھنے کے انسان ذات باری کی شانِ سرمدیت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس نے ذاتِ الٰہی کی ماورائیت کو بھی تصور اسلامی کے مطابق برقرار رکھا ہے۔ بعض صوفیا کے مثل وہ عقیدۂ حلول کا قائل نہ تھا۔ اس کے نزدیک ''انسان کامل'' یا مردِ مومن کی زندگی جو آئین الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ فطرت کی عام زندگی شریک ہو جاتی ہے اور اشیا کی حقیقت کا راز اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر ''انسان کامل'' عرض کی حدود سے نکل کر جوہر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اس کا کلام خدا کا کلام اور اس کی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو اس طرح استوار کرے کہ اس کے سارے افعال و اعمال میں اسی کے مشاہدے اور حضور کی کیفیت حاصل ہو تو یہی عین دین ہے۔ تعبد میں تجرّد کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ انسانِ ذات واجب کے وجود علمی سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ شہود اس پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود الٰہی وجود بن جاتا ہے۔ اسی خیال کو بالِ جبریل میں یوں پیش کیا گیا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولےٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

(بالِ جبریل، ص ۹۷)

اپنے نفس میں فطرت کی تمام قوتوں کو مرتکز کرنے سے مردِ مومن میں تسخیر عناصر کی غیر معمولی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کے باعث وہ اپنے آپ کو نیابتِ الٰہی کا اہل ثابت کرتا ہے۔ اس کی ایک نظر افراد کے افکار میں زلزلہ ڈال دیتی اور اقوام کی تقدیر میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ اس قسم کی مثالوں سے خالی نہیں ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو شخص نیابت الٰہی اور خلیفتہ اللہ فی الارض ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ وہی انسانِ کامل ہے۔ انسان کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ انسان کے روحانی ارتقا کا خلاصہ ہے ''حیات'' یا ''خودی'' مدتوں تک مسلسل روتی رہتی ہے۔ تو کہیں جا کر ایک انسان کامل ہوتا ہے۔ چناں چہ اقبال کہتے ہیں:

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ فی نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس ''دانائے راز'' کا ظہور حقیقتِ محمدؐ کی صورت میں ہو چکا ہے۔ آپ ہی ''دانائے راز'' اور ''انسانِ کامل'' ہیں۔

قرآن مجید میں آیا ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اس کی رو سے انسان آنحضرت صلعم کی ذاتِ بابرکت کو نمونہ قرار دے کر انسانِ کامل بننے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اقبال کے عقیدے کے مطابق انسان کے اندر نائب الٰہی بننے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ اس کی بین دلیل خدا کا قول اِنّی جاعل فی الارضِ خلیفۃ ہے۔ انسانِ کامل دنیا میں خدا کا حقیقی حکمراں ہوگا۔ وہ اپنی فطرت کے خزانہ سے دوسروں کو ''دولتِ حیات'' بخشے گا۔ انسان ارتقا کے مدارج جس قدر طے کرتا جائے گا، اسی قدر وہ اس سے قریب تر ہوتا جائے گا اور جس قدر اس کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قدر وہ کمال کے درجے تک پہنچتا جائے گا۔(۵)

''انسانِ کامل'' کامل ترین خودی ہے۔ انسانیت کے ارتقائی مدارج میں جس قدر مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں، وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہوسکتی ہیں۔ انسانِ کامل دراصل موجودہ انسان کی جسمانی اور روحانی معراجِ کمال ہوگا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی اور اس کے اندر قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔ وہ انسانِ کامل تمام کائنات پر حاوی ہوگا۔

انسانِ کامل کے اندر وہ قوت موجود ہے جس کی رو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اپنے کلام میں عموماً انسانِ کامل کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ جیسے مردِ مومن، مردِ مسلمان، مردِ خدا، مردِ حق، مردِ حرا، مردِ آزاد، مومن، مومن جانباز، مردِ کامل، قلندر، فقیر وغیرہ۔ ان سب کا مفہوم ان کے نزدیک ایک ہی ہے یعنی ''انسانِ کامل''۔(۶)

اقبال کا مردِ مومن زندہ جاوید ہے، اس لیے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے، اور اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لیے گزر جاتی ہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ملّت اسلامیہ کا ہر فرد ہمیشہ باقی رہے گا اور موت کبھی اسے اپنی آغوش میں نہ لے گی بلکہ اس کی مثال اس بحر رز خار کی ہے جس کی گود میں موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور فنا ہوتی رہتی ہیں، حیات انسانی کے اس سمندر میں بھی موجیں اٹھتی رہیں گی اور فنا ہوتی رہیں گی، لیکن اس کی حقیقت ہمیشہ باقی رہے گی۔

اقبال کی نگاہ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں بلکہ اس کی نگاہ کہیں اور پہنچی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف

مردِ مومن ہے، عالم کا وجود اس کے لیے ہے اور وہ صرف اللہ کے لیے، علما و محدثین کے نزدیک یہ حدیث ''لولاک لما خلقتُ الافلاک'' کی صحت لفظاً اور روایتاً خواہ کیسی ہی مشکوک ہو، لیکن اس کی نگاہ حقیقت میں کچھ اور دیکھتی ہے، وہ قرآن کی روح اور اس کی حقیقت پر نظر رکھتا ہے. اس کے سامنے ایک ''مسلمان'' اور اس کا بلند ''پیغام'' ہے، وسیع انسانی تاریخ پر اس کی غائر نظر ہے، عالم کی قدروں اور اشیا کی طبیعتوں کا اسے خوب اندازہ ہے، اس لیے یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لیے وجود میں آئے ہیں، وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے۔ اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے:

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور اس عقیدہ و فکر کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے اس پر مسلسل جدوجہد اور کوشش واجب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک مسلمان ہوا کے رُخ پر نہیں چلتا بلکہ وہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ پھیر دے، عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج کا رُخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے اس لیے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کے لیے ایک زندہ پیام رکھتا ہے، جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے، اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے، اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمے دار ہے، دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے، اس عالم میں وہ صاحبِ امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کے لیے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کر دے بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں پر آ لگے، اقبال کے نزدیک ''چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی۔ کا نظریۂ زندگی ایک مردِ مومن کے لیے کسی طرح صحیح نہیں وہ کہتا ہے:

حدیث کم نظراں ہے ''تو بازمانہ بساز''
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

اقبال کا خیال ہے، ایک مومن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے، اس کا کام حیاتِ انسانی کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے اور اس سلسلے میں اسے تخریب سے بھی کام لینا پڑے تو صحیح ہے اور یہ بربنائے تعمیر و اصلاح ہوگا۔

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا ایک مردِ مومن کا کام نہیں، اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں، جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے ہیں، مردِ مومن خود تقدیرِ الٰہی ہے۔

(بحوالہ ''نقوشِ اقبال''، ص ۱۲۱ تا ۱۲۳)

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر ایک نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ صالح انقلاب ہمیشہ ''مردِ مومن'' کا مرہونِ منت رہا ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے، اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے، وہ انقلاب کا قائد اور زندگی کا پیغامبر ہے، زندگی کی تاریک راتوں کے لیے گویا وہ صبح صادق کا مؤذن ہے اور اس کی اذان کی آواز عالم کے اس سکوت کو توڑ دیتی ہے، جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی اور موت کا سا بھیانک سکون رکھتا ہے اور پھر وہ اذان اس تھکی ہاری نیند کی ماری دنیا کو ایک نشاط اور زندگی بخشتی ہے، یہ وہی اذان اور بلند پکار ہے، جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی جس نے اس وسیع کائنات کو ایک گہری نیند سے بیدار کیا جو کہ صدیوں سے مدہوش پڑی تھی اور یہ اذان مردہ انسانیت اور پریشان حال دنیا کے لیے ایک صورِ قیامت ثابت ہوئی اور آج بھی اس اذان میں انسانیت کو جگانے اور ضمیر انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت و طاقت موجود ہے، ضرورت صرف اس مردِ مومن کی ہے جو اسی روح بلالی سے پکار دے:

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

اور ایک مردِ مومن کی اذان ہی اس ''سحر'' کو نمودار کرے گی جس سے ایک ''عالم نو'' انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگا۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک مردِ مومن کی طاقت و قوت خرق عادت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی طاقت کے سامنے عقل انسانی حیران ہے بلکہ وہ انسان کے لیے ایک معجزہ سے کم نہیں، وہ اپنے پیغام اور اپنے ایمان و یقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت قدرت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے، اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے۔ (بحوالہ ''نقوشِ اقبال''، ص ۱۲۳۔۱۲۴)

انسانِ کامل حقیقت کا مظہر ہے۔ وہ کائنات کا ایک ایسا خلاصہ ہے، جس کی ذات میں خدا کی صفاتِ کاملہ منعکس ہوتی ہیں اور جس طرح حقیقتِ محمدیہ کائنات کی تخلیقی حقیقت ہے، اسی طرح انسانِ کامل بھی تخلیق کائنات کی علت ہے۔ چناں چہ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے:

کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً، فَاَحبَبتُ اَن اَعرَف، فَخَلقتُ الخلق۔ ابن عربی کہتے ہیں:

چوں کہ صرف انسانِ کامل ہی حقیقی معنوں میں خدا کو پہچانتا اور محبوب رکھتا ہے، اس لیے انسانِ کامل ہی دراصل تخلیق کائنات کی

علت ہے۔(۷)

صوفیائے کبار کی طرح اقبال نے بھی دنیا کے سامنے ''انسانِ کامل'' کا نظریہ پیش کیا ہے لیکن چوں کہ انھوں نے ''وحدت الوجود'' کی مخالفت کی ہے اور اس کے برعکس نظریۂ ''خودی'' کو پیش کیا ہے، یعنی ان کے نظریہ ''انسانِ کامل'' کی بنیاد دیگر صوفیائے کبار کی طرح ''وحدت الوجود'' نہیں، بلکہ ''خودی'' اور محض ''خودی'' پر ہے۔

دیگر صوفیا نے جہاں ''وحدت الوجود'' کی رو سے انسان کا ذاتِ خداوندی سے اتحاد اور اتصال پیدا کر کے ''انسان کامل'' کا نظریہ پیش کیا، وہاں اقبال نے انسان کی ہستی کو خدا کی ہستی سے الگ قائم کیا۔ اس کو عشق و محبت سے مستحکم کر کے تَخلَقُوا بِاَخلاقِ اللہ کی رو سے صفات الٰہیہ سے متصف کرنے کی تلقین کی اور انسانی ''خودی'' کو ایک خاص لائحۂ عمل کے ماتحت تربیت دے کر ''انسانِ کامل'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں اگرچہ دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ صوفیا اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کر کے اس منزل تک پہنچتے ہیں۔ اقبال اپنی ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ قائم کر کے اس منزل تک پہنچتے ہیں۔(۸)

اقبال اربابِ تصوف کے ان تمام تصورات و نظریات کے حریف و معاند تھے جن سے انسانی انفرادیت فنا اور خودی مضمحل ہو۔ وہ رسولؐ کے انسانِ کامل ہونے پر ایمان تیقن رکھتے تھے۔(۹)

اقبال کا انسانِ کامل مومن ہے جس کے اوصافِ عظیمہ قوت۔ بصیرت عمل اور فراست ہیں۔ یہی صفات درجۂ تکمیل تک سیرتِ رسولؐ میں موجود تھیں۔ جو انسانی محاسن اور صفات جمیلہ کا پیکر عنصری تھے۔ ان ہی کی سیرت و سنت کو راہِ عمل بنا کر ایک مومن اپنی تقدیر کا ناخدا بن سکتا ہے۔ اور معراجِ کمال تک اس کی رہنمائی ہو سکتی ہے۔ بالِ جبریل میں اقبال مومن کا مقام بیان کرتے ہیں:

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ!

(بالِ جبریل، ص۱۳۲)

اقبال کے ''انسانِ کامل'' کے تصور کو اکثر لوگوں نے غلط سمجھا اور اس کو نٹشے کے ''فوق البشر'' کے مماثل قرار دیا۔ دراصل ان دونوں کے تصورات میں بنیادی فرق ہے۔ اقبال کا ''انسانِ کامل'' اخلاق فاضلہ کا نمونہ ہے جو اپنی زندگی میں اعلیٰ قدروں کی تخلیق کرتا ہے۔ برخلاف اس کے نٹشے کا ''فوق البشر'' کسی اخلاق کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک رزمِ حیات میں نیکی نہیں بلکہ قوت درکار ہے۔ تاکہ کمزوروں پر غلبہ حاصل کیا جاسکے۔ اقبال کا ''انسانِ کامل'' بلاشبہ سخت کوشی، جدوجہد، خواہش خطرات اور مقاصد آفرینی سے اپنی خودی کو مکمل کرتا ہے اور اس طرح عناصرِ فطرت پر قابو حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کی خودی کی جدوجہد اخلاقی قوانین کے حدود کے اندر ہوتی ہے۔ نٹشے کا ''فوق البشر'' اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے۔(۱۰)

''انسانِ کامل'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدید حیات کرتا ہے۔ اس کی فکر زندگی کے خواب پریشاں کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ وہ تاریخ کی تخلیقی رو کو اپنے

حسبِ منشا جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانی صفاتِ عالیہ کا اظہار تاریخ میں اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ خود تاریخ کے امکانات اور تعینات سے ماورا ہوتا ہے لیکن اس کی جدوجہد اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ وہ جانِ عالم اور جمیع موجودات کا خلاصہ ہے۔ اقبال نے اس کی ذات کو ''سنوار اشہب دوراں'' اور ''فروغ دیدہ امکاں'' سے تشبیہ دی ہے اور اس کی ذات سے ایجاد و تسخیر کی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

حواشی

(۱) مطالعاتی رہنما کوڈ ۷۰۲، تحریر ڈاکٹر محمد ریاض، ص ۴۲

(۲) روحِ اقبال، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص ۱۸۶

(۳) ایضاً، ص ۲۰۱، ۲۰۲

(۴) نقوشِ اقبال، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۱۸

(۵) اقبال کے فکری آئینے، ڈاکٹر حسن رضوی، ص ۲۳۶، ۲۳۷

(۶) ایضاً، ص ۲۳۸

(۷) ایضاً، ص ۲۳۲

(۸) ایضاً،

(۹) اقبال کا فلسفہ سیاسیات، ڈاکٹر پروین شوکت علی، ص ۲۶۹

(۱۰) روحِ اقبال، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص ۲۰۴

کتابیات

(۱) اقبال کا فلسفۂ سیاسیات، ڈاکٹر پروین شوکت علی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ستمبر ۱۹۷۷ء

(۲) اقبال کے فکری آئینے، ڈاکٹر حسن رضوی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

(۳) روحِ اقبال، ڈاکٹر یوسف حسین خان، القمر انٹرپرائز، لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء

(۴) مطالعاتی رہنما کوڈ ۷۰۲، تحریر ڈاکٹر محمد ریاض، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

(۵) نقوشِ اقبال، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، ۱۹۷۳ء

رفعت سروش، بھارت

اقبال — شاعرِ رنگ و بو

اقبال کا کلام مناظرِ قدرت کا چمنستان ہے۔ پہاڑ، دریا، آبشار، صبح، شفق، رنگ، خوشبو، پھول، پرندے، کیا کچھ نہیں ہے ان کی شاعری میں۔ ''بانگِ درا'' کی پہلی ہی نظم 'ہمالیہ' میں ایک جہان رنگ و بو اور فضائے بسیط آباد ہے۔

'گلِ رنگیں' اس نظم میں محض روایتی قسم کی منظر نگاری نہیں ہے بلکہ اقبال واضح کر دیتے ہیں کہ وہ مناظرِ قدرت اور اس کے مظاہر کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کی انفرادیت پر مہر لگ جاتی ہے۔

حضرتِ اقبال ٹھہرے رنگ و بو کے راز داں
کس قدر پختہ ہے ان کا استعاراتی نظام
آئینہ ہے فکرِ شاعر صورتِ آبِ رواں
لفظ ان کے شعر میں آتے ہیں باصد اہتمام

قدین اقبال نے اقبال کے پیغام پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے فلسفے کی تشریحات اور تاویلات کی ہیں ان کی شاعری کی تفہیم زمان و کان کے تناظر میں کی ہے۔ ان کو بجا طور شاعرِ مشرق کا خطاب دیا ہے اس کرۂ ارض کو سیاسی نظام حیات نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے یعنی مشرق اور مغرب میں۔ اقبال مشرق کے نغمہ خواں ہیں مشرقی تہذیب کے علم بردار ہیں اور مشرق کی قدیم اقدار اور عظیم روایات کے فروغ کے لیے وہ اپنے فن شاعر کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ انسان کی عظمت کے حدی خواں ہیں اور رجائیت ان کے حرف حرف میں سانس لیتی ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے پیغام کی عظمت اور بلاغت قاری کے ذہن و دل کو اس قدر مسحور کرتی ہے کہ ان کے کلام کی نزاکتوں اور الفاظ کی نفاستوں سے نظر پھسل جاتی ہے۔

اقبال شاعر ہیں اور شاعر کا بنیادی سروکار لفظ سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر احساس کو لفظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے تب کہیں اس کا جہانِ شعر تخلیق ہوتا ہے وہ کس طرح کے الفاظ کو اپنی افتادِ طبع کے مطابق چنتا ہے، نقاد یا قاری کی رسائی ان الفاظ تک ہو تو وہ شاعر کی تفہیم کے طلسم سے آشنا ہو سکتا ہے۔

اقبال کا کلام مناظرِ قدرت کا چمنستان ہے۔ پہاڑ، دریا، آبشار، صبح، شفق، رنگ، خوشبو، پھول، پرندے، کیا کچھ نہیں ہے ان کی شاعری میں۔ ''بانگِ درا کی پہلی ہی نظم 'ہمالیہ' میں ایک جہان رنگ و بو اور فضائے بسیط آباد ہے۔

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا — کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ میرا

اور دوسری نظم ہے 'گلِ رنگیں' اس نظم میں محض روایتی قسم کی منظر نگاری نہیں ہے بلکہ شاعر اپنی زندگی کا اس سے تقابل کرتا ہے اور اس طرح گلِ رنگیں استعارہ بن جاتا ہے بے سوز و ساز زندگی کا اور اقبال واضح کر دیتے ہیں کہ وہ مناظرِ قدرت اور اس کے مظاہر کو وسیلہ اظہار بناتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کی انفرادیت پر مہر لگ جاتی ہے۔ 'گلِ رنگیں' کو ان الفاظ میں خطاب کرتے ہیں:

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں مَیں سراپا سوز و سازِ آرزو — اور تیری زندگی ہے بے گدازِ آرزو

اقبال سیاسی افکار کے اعتبار سے ہی 'شاعرِ مشرق' نہیں ہیں، بلکہ وہ صحیح معنوں میں شاعرِ مشرق ہیں۔ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کے دل دادہ، صبح کے مناظر کے والا و شیدا، شفق کی سرخی ان کے دیوان میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ اقبال کی ابتدائی نظموں ہی میں ہے 'انسان اور مناظرِ قدرت' اس میں انسان وہ خود ہیں، محوِ نظارہ ہیں:

صبح خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے — بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے
پرتوِ مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا — سیمِ سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا
مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے — تیری محفل کو اُسی شمع نے چمکایا ہے
گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں — یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں
سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں سے ہری — تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

یہ مکالمہ جاری رہتا ہے مگر اس وقت کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے ہم 'کلیاتِ اقبال' کے ورق کھولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں کی سرخ پوشاک کی جلوہ گری جگہ جگہ ہے اور رنگا رنگ پھولوں کی سج دھج ان کی شاعری کو پر بہار کرتی ہے:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح — اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کا اقتباس۔ صبح کا دلفریب منظر ہے جس میں رنگ و بو کا ایک جہاں نظر آتا ہے:

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح — داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ — بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار — ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار

'ذوق و شوق' اقبال کی بہت مشہور نظم ہے جس میں اسلام کی عظمتِ رفتہ کا ہوش ربا تذکرہ ہے اور اس کے ڈانڈے تصوف سے جا ملتے ہیں۔ اس نظم میں اقبال یوں مخاطب ہیں:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرّۂ رنگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

اس نظم کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے جس میں صبح کا رنگ و نور موجزن ہے:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں — چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حُسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود — دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

اقبال بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ موضوع کو بھی رنگ و بو اور مناظرِ قدرت کے استعاروں میں بیان کرنے میں لطف حاصل کرتے ہیں۔ بیان ہے حضرتِ آدم کے جنت سے رخصت ہونے کا۔ مگر اقبال کے یہاں کہیں قنوطی لہجہ نہیں ہے، یہ وہ لمحہ ہے جسے اقبال آدم کی زندگی کا رنگیں پہلو تصور کرتے ہیں، چناں چہ زمین کی زبانی اس مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہی صبح کا طربناک منظر اور رنگ و بو کا موسم:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ — ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

اقبال کی مشہور نظم 'ساقی نامہ' کی ابتدا ہی بہاریہ ہے۔ رنگِ خوشبو، پھول ہی پھول، پرندوں کے چہچہے:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

علامہ اقبال فطرتاً رجائیت پسند ہیں اور اپنے آپ کو موجِ نسیم سحری سے تعبیر کرتے ہیں:

فطرت مری مانند نسیمِ سحری ہے رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

پھولوں میں زندگی گزارنا ان کی فطرت ہے اور یہی پیغام اپنے بیٹے جاوید کو دیتے ہیں۔ جو دراصل پوری قوم کے بلکہ دنیا کے نوجوانوں کے لیے ہے:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

سکوتِ لالہ وگل سے کلام کرنا اقبال کی فطرت شناس طبیعت کی غمازی کرتا ہے۔ رنگ و بو کے شیدا اقبال جب دمِ سحر گلشن میں ایک کلی کو دیکھتے ہیں تو اس کے جی کی بات اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینۂ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

'تصویرِ درد' اقبال کی وہ نظم ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر انھوں نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اس نظم میں بھی ملت کی پریشان حالی کو انھوں نے پھولوں کے استعاروں میں بیان کیا ہے:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

اقبال کے یہاں جس قدر سرشاری صبح کے مناظر اور بہارِ چمن کے حوالے سے نظر آتی ہے وہی حال غروبِ آفتاب اور سرخیِ شفق کا بھی ہے اور 'گلِ لالہ' ان کے یہاں جگہ جگہ استعاراتی انداز میں استعمال ہوا ہے۔ غروبِ آفتاب کا کیا خوب صورت منظر ہے:

ٹوٹ کی خورشید ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے یا کھولی ہے فصدِ آفتاب

غروبِ آفتاب کا ایک اور منظر۔ نظم ہے 'کنارِ راوی'۔

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دست رعشہ دار میں جام

دریا کے پانی میں تحرک ہے اس لیے دستِ رعشہ دار خوب کہا ہے۔ غروبِ آفتاب کا ہی ایک اور منظر اس میں سرخیِ شفق کے ساتھ یہاں کی زندگی کے خوب صورت رسم و رواج کی جھلک ایک عجیب لطف پیدا کر رہی ہے:

مہدی لگائے سورج جب شام کو دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

نظم 'بزمِ انجم' میں اقبال نے شام کا منظر کس شوخی سے نظم کیا ہے:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشتِ اُفق سے لے کر لالہ کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

ایک اور منظر 'مسجد قرطبہ' سے:

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

دراصل گلِ لالہ سرخروئی اور فتح مندی کا استعارہ ہے۔ اقبال نے اس ایک لفظ سے جہانِ معنی پیدا کیے ہیں۔ نظم ہے 'طلوعِ اسلام':

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

نظم 'زندگی'۔ اس نظم میں ملّتِ اسلامیہ کو پھر بیدار اور کامران ہونے کا خواب ہے:

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا بہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

اقبال مردِ مسلماں کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہی جگرِ لالہ کا استعارہ استعمال کرتے ہیں:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

نظم 'طارق کی دعا' کا ایک شعر:

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کی خونِ عرب سے

ایک غزل کے شعر میں اس خیال کو نظم کیا گیا ہے کہ اگر موافق آب و ہوا میسر نہ ہو اور ماحول سازگار نہ ہو تو انسان کا جوہرِ ذاتی کھل نہیں سکتا:

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

اپنی ایک مختصر نظم 'اساتذہ' میں اقبال نے بہت شاعرانہ انداز میں فرسودہ نظامِ تعلیم پر ضرب لگائی ہے وہ روایتی اساتذہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بہترین طالب علم پیدا کرنے کے لیے مجہول اور بے راہ رو استاد ناکارہ ہیں۔ یہاں لعلِ بدخشاں (یعنی سرخ رنگ کا استعارہ) عجیب انداز سے نظم ہوا ہے:

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں — بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت — وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

ایک اور نظم کے چند اشعار میں اس کیفیت کا اظہار ہے کہ ماحول سازگار ہونے کے باوجود اگر فرد یا قوم میں جذبۂ تحصیل کی کمی ہو تو نتیجہ معلوم:

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے — سمن ہے، سبزہ ہے، بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم — یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

اقبال بے راہ خورشید کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ افکارِ تازہ کا نیا سورج طلوع ہو کیوں کہ...:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبال انسانیت کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ زوالِ آدمِ خاکی کو وہ وقتی چیز سمجھتے ہیں۔ سرخی شفق کے استعارہ کے ذریعے ہی وہ اپنے اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ صورتِ حال نئی صبح کا پیش خیمہ ہے:

شفق نہیں مشرقی اُفق پر، یہ موجِ خوں ہے، یہ موجِ خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

گلِ لالہ کو وہ پھولوں میں سب سے افضل تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم 'بلادِ اسلامیہ' میں تہذیبِ حجاز کو لالۂ صحرا سے تعبیر کرتے

ہیں۔ صحرائے عرب کی رعایت سے حجاز کی تہذیب کو لالۂ صحرا کہنا شاعر کے کمالِ فن کی دلیل ہے:

یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز
لالۂ صحرا، جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز

اور ایک شعر میں تو وہ لالہ کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ استعاراتی طور پر پوری قوم پر منطبق کرتے ہیں:

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی
تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ

انسانی زندگی کی رنگینیٔ وجود کو بھی اقبال سے ہی تشبیہ دیتے ہیں:

تو نے دیکھا ہے کہاں اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگین قبا کیوں کر ہوا

آرزوؤں اور امیدوں کی چمن بندی کرنے کے عمل کو بھی اقبال پھول کے استعارے میں ہی بیان کرتے ہیں:

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

اقبال نے کہیں لکھا ہے:

جہاں ہے میرے لیے میں نہیں جہاں کے لیے

اس مصرعے سے دنیا سے بے نیازی اور ماورائے وجود زندگی کا اشارہ ملتا ہے اور دراصل اقبال کا رویہ یہی تھا کہ چمنستانِ زندگی کی بہار دیکھیے مگر اپنے آپ کو اس میں ضم کر دینا غلط ہوگا۔ ان کے قلندرانہ مزاج میں دنیا سے بے گانگی کا تصور جاں گزیں ہے مگر وہ اس کی تکذیب بھی نہیں کرتے کیوں کہ قتیلِ رنگ و بو ہیں:

گلزارِ ہست و بود کو بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

وہ محبت کو وجہِ تخلیق عالم اور تمام رنگینیوں، بہاروں اور رعنائیوں کا موجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظم 'محبت' اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

حسنِ ازل کی جلوہ گری بھی رنگِ شفق اور لالہ و گل کے حوالے سے ہوتی ہے۔ دراصل اقبال کی نگاہِ نکتہ شناس ہر چیز کو مادیت

سے گزر کر دیکھتی ہے۔ ان کی نظم 'کوششِ ناتمام' کا ایک اقتباس:

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح — چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے
حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں — کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے

اور جب گلِ لالہ کے ورق الٹتے ہیں تو:

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

اقبال کی نگاہِ نکتہ شناس مظاہرِ فطرت کو حرف حرف پڑھتی ہے اور گلِ لالہ کی پتی پتی پر وہ اسرارِ حیات کا مطالعہ کرتی ہے اور یہ مطالعہ علم کتابی سے کہیں زیادہ بامعنی ہے:

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل — نہ کام آیا ملا کو علمِ کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں — غزل خواں ہوا پیرکِ اندرابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے — کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی

چمن کی پتی پتی، کلی کلی اور پھول کی پنکھڑی سے یوں ہم کلام ہونا کہ وہ اپنے سینوں کے راز شاعر پر آشکار کر دیں، ہر شاعر کے امکان میں کہاں۔ یہ توفیق تو اسی کو عطا کی جاتی ہے جس کا دل محرمِ رازِ فطرت ہو اور جو ذرّے ذرّے میں حسنِ ازل کی تابانی کو محسوس کر سکتا ہو:

پھر بادِ بہار آئی اقبالؔ غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

بادِ بہار کلی کو گدگداتی ہے وہ اپنا نقابِ رخ اٹھاتی ہے اور اس کی جلوہ ریزی کے ساتھ اس کی روح بھی برنگِ نکہت فضا میں پھیل جاتی ہے۔ پھول اور خوشبو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوشبو اپنے وجود کے لیے پھول کی محتاج ہے مگر جب وہ اس کا نازک دامن اپنی گرفت سے آزاد کر دیتا ہے تو خوشبو رنگینیِ چمن کا راز لے کر پرواز کر جاتی ہے۔ اب یہیں سے اس کے ظرف کا امتحان ہے۔ زمانہ کم ظرفی کا ہے۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم 'شکوہ' میں انسان کی اسی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے:

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

مگر زندگی میں ارتباطِ رنگ و بو ضروری ہے۔ ہاں اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ چمن میں گلچیں بھی ہے۔ اس لیے رنگ و بو سے محبت دائمی سکون میں رخنہ اندازی کا باعث بھی ہو سکتی ہے:

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اُڑ گئی شبنم — مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں ناآشنا ہونا — جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

جہانِ رنگ و بو سے قطعِ آرزو کرنا اور جیتے جی، یہ عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ خود اقبال بھی اپنے آپ کو اس کا اہل تصور نہیں کرتے۔ اپنی نظم 'عاشقِ ہرجائی' کی ابتدا ہی میں فرماتے ہیں:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؔ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

اس نظم میں وہ اپنی مثال 'بوئے گل' سے دیتے ہیں:

مثلِ بوئے گل لباسِ رنگ سے عریاں ہے تو
ہے تو حکمت آفریں، لیکن تجھے سودا بھی ہے

بوئے گل کو آپ لباسِ رنگ میں محسوس کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ بوئے گل میں جسامت نہیں ہے تو وہ روح ہے پھول کی۔ ایک اور شعر میں اقبال نے خوشبو کو 'غنچے کی نوا' کہا ہے اور 'نوا' کا بھی کوئی جسم نہیں ہوتا۔ نظم 'شمع' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

اپنے استاد مرزا داغ کی رحلت پر اقبال نے ان کی روح کی پرواز کو خوشبو سے تعبیر کیا ہے۔ خطاب ہے زبانِ اردو سے:

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

ایک جگہ اپنے آپ کو بھی مثلِ نکہتِ گل کہا ہے اقبال لاہور سے دہلی درگاہِ حضرت محبوب الٰہی حاضری دینے آتے ہیں۔ عقیدت کا عالم ملاحظہ ہو:

چمن کو چھوڑ کے نکلا مثالِ نکہت گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر، درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

خوشبو کا استعارہ 'جوابِ شکوہ' میں اس طرح آیا ہے کہ اقبال بنوائے ربِّ جلیل مسلمان سے خطاب فرماتے ہیں:

مثلِ بوقید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا
رخت بردوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا

اپنی مشہور نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں بھی اقبال خوشبو کی طہارت اور شفافیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسجدِ قرطبہ اسلام کی عظمتِ رفتہ کی گواہ ہے:

بوئے سمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

'حضورِ رسالتِ مآب میں' اقبال کی مختصر مگر ہم نظم ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے تخیل کے پر لگا کر حضورِ رسالت مآبؐ میں پہنچتے ہیں:

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو — حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضور نے اے عندلیب باغِ حجاز — کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

پھر ارشاد ہوتا ہے:

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

اقبال لالہ و گل کے محاورے میں ہی جواب دیتے ہیں:

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

غرض کلامِ اقبال میں رنگ و نور و نکہت کا ایک جہاں آباد ہے اور اقبال کی خلاق طبیعت نے ان علائم کو بڑے فنکارانہ انداز سے استعمال کیا ہے مگر وہ خود کسی ایک رنگ یا کسی ایک فضا میں مقید ہونے کو انسان کی معراج نہیں سمجھتے اپنی اس بے نیازی کو وہ اپنی نظم 'اہلِ ہنر سے' میں واضح کرتے ہیں۔ دراصل یہ نظم ان کا اعلان نامہ ہے اور اس پیغام کا سرنامہ ہے جس کے لیے وہ مشہور ہیں:

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ — عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود
تیرے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک — تنگ ہے تیرے لیے سرخ و سپید و کبود
تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر — تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود

اقبال کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ محض شاعر نہیں بلکہ فلسفی بھی ہیں۔ اس لیے ان کے بظاہر مناظرِ قدرت اور گل و بلبل کے متعلق اشعار میں بھی ان کی فلسفیانہ فکر کی زیریں لہر موجزن رہتی ہے۔ بڑی آسان سے ایسا شعر کہنے پر قادر ہیں جس کا ایک مصرعہ کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دوسرا مصرعہ اس کی نفی یا تشکیک کا پہلو نمایاں کر دیتا ہے:

یہ مہر و مہ، یہ ستارے، یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا موجود

بہار کی رعنائی، سحر و شام کی دل فریب منظر نگاری اور مظاہرِ فطرت کی عریض و بسیط فضا کو دیکھنے کے لیے جو نگاہ چاہیے وہ آسانی سے کب نصیب ہوتی ہے۔ اقبال کی صرف چار اشعار پر مشتمل نظم 'نگاہ' ان کی وسعتِ نگاہ کی غماز ہے۔

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی — شباب و مستی و ذوق و سرور رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی — یہ بحر، یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
سفر عروسِ قمر کا عمارئی شب میں — طلوعِ مہر و سکوتِ سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

اردو شاعری میں اقبال سے پہلے بھی شعرا کرام نے مناظرِ قدرت بالخصوص طلوع غروب آفتاب کے مناظر کو نظم کیا ہے مگر اقبال نے اس میدانِ سخن میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بے مثال ہے۔ غزل کی شاعری تو مناظرِ قدرت سے علاقہ نہیں رکھتی مگر ہماری مثنویوں بالخصوص، 'سحرالبیان' اور 'مثنوی گلزارِ نسیم' میں نہایت دل کش منظر نگاری کے نمونے ہیں۔ مگر وہ ایک اکہری شاعری ہے۔ سیدھا سپاٹ منظر۔ مراثی انیس میں صبح، دوپہر اور شام کے نظارے بکھرے پڑے ہیں مگر چوں کہ وہ مرثیہ نگاری ہے اس لیے انیس کے منظروں پر سوگ اور اداسی کی چھاپ ہے۔ اقبال کی شاعری کا ایک تو کینوس بہت بڑا ہے اور پھر ان کا لب و لہجہ نشاطیہ ہے، زندگی آموز ہے اور وہ مظاہرِ قدرت کے استعاراتی انداز میں استعمال پر قادر ہیں۔ بالخصوص سرخ رنگ ان کا محبوب ہے جو چاہے آسمان میں بکھرا ہو یا زمین کے لالہ و گل میں۔ نشاطِ حیات کا استعارہ ہے۔

''کلیاتِ اقبال'' کے سرسری مطالعے سے بھی رنگ و بو کے کیسے کیسے گوشے سامنے آئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں رنگوں کا جہاں آباد ہے اور یہ چمن معانی کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ ''اخبارِ اردو''، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء)

جاوید منظر

علامہ اقبال اور جدید اردو غزل

اردو دنیا اپنے محسنوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کرتی ہے اردو ادب کے باب میں شاعری اپنی مستحکم روایات کی امین ہے اور شاعری کے حوالے سے غزل کا پیراہن اپنے وجود میں اَن گنت کہکشائیں سمیٹے چلی آتی ہے۔ جس سے اردو زبان و ادب میں غیر معمولی فکر و احساس کی راہیں تعمیر ہوتی چلی گئیں ہیں۔

ولی دکنی سے لے کر علامہ اقبالؒ تک غزل کے پیراہن میں جس قدر وسعت ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب بات شاعری کی ہوتی ہے تو ہم اٹھارویں صدی کو دیکھتے ہیں۔ اس صدی کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میر کو مانا گیا ہے اسی طرح انیسویں صدی کے اردو شاعری کے سب سے بڑے شاعر میرزا اسداللہ خان غالب مانے گئے ہیں اور بیسویں صدی کے علامہ اقبال کو اہم ترین شاعر مانا گیا ہے۔

علامہ اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، اقبال کے کلام کی بلندی فکر و فلسفہ اور رنگ و آہنگ نظم میں کہیں بہتر طور پر نمایاں ہے۔ مگر علامہ اقبال نے جدید غزل کو ایک نئے اور منفرد لہجے سے روشناس کرایا ہے۔ علامہ اقبال کی غزل کو پڑھتے ہیں تو ہم حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے غزل کے حوالے سے قاری کو جگہ جگہ یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اقبال نے نظم کے علاوہ غزل کو نئی فکر کی اساس بنایا نئے استعاروں اور نئی علامتوں سے غزل کی جہت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور اردو غزل کی روایت سے غزل کو الگ کر دیا اور یوں ایک جداگانہ طرز احساس عطا کیا ہے۔ علامہ اقبال بیسویں صدی کے اہم ترین شاعر ہیں، ان کے کلام میں خیالات کی فراوانی اور نئے نئے معانی و مفاہیم ہیں اردو دنیا کے اَن گنت شعرا کو دیکھیں تو ان کے کلام میں اتنی زیادہ فکر انگیزی اور نیا اندازِ تخاطب نہیں ملے گا جب کہ علامہ اقبال کی ہر نظم اپنی روح میں بیش بہا مضامین سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ نظم کی ایک ہی لائن میں وہ گیرائی اور گہرائی ملتی ہے کہ کتابیں تحریر کی جاسکتی ہیں۔ یہی خوبی ہے جو علامہ اقبال کو ان کے ہم عصروں سے انھیں ممتاز اور منفرد کرتی ہے۔

علامہ اقبال اردو اور فارسی زبان کے اہم شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن کے استاد مولوی سید میر حسن نے علامہ اقبال کو مشرقی علوم کا درس دیا، یوں میر حسن کی صورت میں ایک لائق و فائق استاد علامہ اقبال کو میسّر آ گیا۔ مولوی صاحب نے علامہ اقبال کو فارسی اور عربی کی تعلیم دی۔

اردو شاعری میں علامہ اقبال نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے ادبی دنیا کو بیش بہا خزانوں سے اردو غزل اور نظم کی صورت میں

نوازتے رہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے مسلمانوں کی فکر کو جگایا آزادی کی اہمیت اور اسلامی تہذیب کی وقعت کے مطابق مسلم قوم کو آگاہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے درخشاں ابواب اپنی شاعری میں سموئے تاکہ موجودہ دور کے مسلمان اپنی تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت، معاشرت اور تمدن سے آگاہ ہوں۔

علامہ اقبال نے اردو غزل میں ایک اہم راہ یوں اختیار کی کہ غزلوں کو غیر مردّف انداز سے نوازا، اور ان میں بالکل نئے لہجے کو اختیار کیا۔ جہاں علامہ اقبال نظم سے کام نہیں لیتے تھے وہاں غزل کے دو مصرعوں کو اپنی فکر کا محور بناتے ہوئے اپنی بات باآسانی قاری تک پہنچاتے تھے یہی ایک بہت اہم ادبی کارنامہ ہے۔ میر تقی میر اور غالب کی موجودگی کے باوجود اپنی غزل کو نئے انداز سے فکر کا جامہ پہنانا ادبی کارنامے سے کسی طور کم نہیں ہے۔ یہاں علامہ اقبال کی غزلوں کے چند اشعار جو ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' میں علامہ اقبال کے کلام میں ملتی ہیں یہ غزلیں غیر مردّف غزلیں ہیں ان غزلوں کو پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے غزل کی اس روایات کو بالکل بدل دیا ہے جو قلی قطب، ولی دکنی سے میر و غالب کے دور سے ہوتی ہوئی اقبال تک پہنچتی ہے۔ یہی علامہ اقبال کا کمال ہے کہ میر و غالب جیسے اہم شعرا کے لہجے سے اپنے کلام کو منفرد رکھا اور غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا جس نے تشنگانِ ادب کو خوب صورت کلام پیش کر کے سیراب کیا۔ علامہ اقبال کے شعری مجموعے ''بالِ جبریل'' سے غیر مردّف غزل کے چند مطلع پیش کیے جاتے ہیں:

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الہ الا ہو

متاعِ بے بہا ہے دردِ سوز آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ بے نیازی

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

علامہ اقبال نے ''بالِ جبریل'' کی طرح مجموعہ کلام ''ضربِ کلیم'' میں بھی غیر مردّف غزلوں کو پیش کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام سے بھی غیر مردّف غزلوں کے مطلع پیشِ خدمت ہیں:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دل ناصبور

نہ میں عجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی سے سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ کا چراغ

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

علامہ اقبال نے جدید غزل میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ موضوعات اور اردو غزل کے اسلوب کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل غزل جو میر و غالب سے ہوتی ہوئی داغ اور امیر مینائی تک ایک رو میں چلی آ رہی تھی کہ علامہ اقبال نے غزل کو ذوقِ یقین اور اعتماد سے مالا مال کر دیا اس وقت علامہ اقبال کے ہم عصروں میں (۱) درگا سہائے رائے، (۲) جگت موہن لارواں، (۳) غلام بھیک نیرنگ، (۴) وحید الدین سلیم، (۵) اسمٰعیل میرٹھی، (۶) نوبت رائے نظر، (۷) ظفر علی خاں۔ یہ تمام شعرا نظم کے شعرا میں شامل تھے اور غزل میں ان شعرا کا کوئی اہم کام سامنے نہیں آیا۔

علامہ اقبال کے بعد کی ایک اہم نسل جس نے نظم میں بہت اہم مقام حاصل کیا غزل میں علامہ اقبال سے متاثر ہوتے ہوئے علامہ اقبال کا اسلوب اپنایا جس میں (۱) تلوک چند محروم، (۲) ساغر نظامی، (۳) جوش ملیح آبادی، (۴) افسر میرٹھی، (۵) حفیظ جالندھری، (۶) روش صدیقی اور احسان دانش کے نام آتے ہیں۔ ان شاعروں نے غزل کو جدید لہجے سے آشنا کیا، جنگ عظیم کے بعد غزل میں نظم کی طرح قومی، ملی اور سیاسی مسائل در آئے جس کے باعث غزل ایک نئی فکر اور نئے انداز سے ہم کنار ہوئی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں نظم اور غزل دونوں اصناف سخن میں گراں قدر اضافہ کیا، لہجے میں نیا انداز پیش کیا اور اپنے بعد کی نسل کو نئے اسلوب سے آشنا کیا۔

علامہ اقبال کے غزل کے انداز کو اپناتے ہوئے نئی نسل نے غزل میں جو اضافہ کیا اس کی مثال دیتے ہوئے ہم یہاں ان کے بعد کی نسل کے اشعار پیش کرتے ہیں جس سے علامہ اقبال کی فکر اور لہجے کی اگلی نسل میں منتقلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حسن ہے جانِ غزل اور عشق ایمانِ غزل
کائنات شعر میں ہے خوب سامانِ غزل
(تلوک چند محروم)

سنا مغنی مجھے وہ نغمہ کہ جھوم جائے شباب تیرا
اگر ذرا بھی کیا تکلف تو چھین لوں گا رباب تیرا
(ساغر نظامی)

لو کھل گیا وہ پرچم خورشید زر نگار
اُٹھو کہ وا دریچہ صد رنگ و بو کریں
(جوش ملیح آبادی)

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ سے سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں
(افسر میرٹھی)

ہو گیا جب عشق ہم آغوش طوفانِ شباب
عقل بیٹھی رہ گئی، ساحل پہ شرمائی ہوئی
(حفیظ جالندھری)

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت
شکست دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں
(روش صدیقی)

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ
(احسان دانش)

علامہ اقبال مستقبل شناس شاعر ہیں، ان کی نظموں اور غزلوں میں انسان فکر کی بلندی، عظمت رفتہ سے متاثر ہو کر اپنے کلام میں بہتر مستقبل کی اساس رکھنے کی طرف رغبت دلانا اہم کام ہے۔ علامہ اقبال کی غزل میں ماضی کی غزل سے منفرد انداز اور اسلوب کی روایت کی بنیاد پڑی مثلاً اقبال کی غزل میں، علم و عمل، ذوقِ یقین، مردِ مومن، شاہین، قصر سلطانی، زمان مکاں، خودی، جبروت وغیرہ شامل ہیں جو ہمیں غزل کی بناوٹ میں نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔

علامہ اقبال نے غزل کہنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ دورِ حاضر کی غزل میں جدید دور کے تقاضوں کو پیش کیا جائے مسلمانوں کو بہتر مستقبل دیا جائے مایوسی اور قنوطیت کے اندھیروں سے نکالا جائے یوں علامہ اقبال نے غزلوں میں غیر مردّف طرز سخن اختیار کرتے ہوئے گل بلبل، عشقیہ مضامین جس میں محبوبہ سے عشق، فاسقانہ شاعری سے اجتناب برتتے ہوئے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ غزل کے حوالے سے یہ بنیادی تبدیلی علامہ اقبال کی اردو شاعری میں ایک منفرد اور اہم کام ہے جسے ان کی اگلی نسل نے سراہا بھی اور اختیار کیا اور جو آج کے جدید غزل گو شعرا نے بھی اختیار کیا یہی علامہ اقبال کی شاعری اور خاص طور پر غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

اقبال۔ایک نئی آواز

پروفیسر افتخار احمد صدیقی

علامہ اقبال ہر لحاظ سے ایک جدید شاعر کہلاتے کے مستحق ہیں۔ان کا فلسفہ خودی و رموز بے خودی، ان کا نظریہ حیات و ممات،، فلسفہ عشق و محبت اور تصور ابلیس، مسئلہ جبر و اختیار، نظریہ حکومت اور جمہوریت، ان کی علامتیں، ان کی زبان اور ان کا اسلوب، اور دیگر موضوعات غرضیکہ ہم ان میں سے جس پر نظر ڈالیں ہمیں ایک جدت اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔آیئے ہم ان حقیقتوں کا جائزہ لیں اور ان کی جدت طبع اور ان کے پیام نو کی کڑیوں کا علاحدہ علاحدہ مطالعہ کریں۔

علامہ اقبال کے یہاں سب سے زیادہ چونکا دینے والی اور انسانیت کو معراج عطا کرنے والی جو چیز ملتی ہے وہ ہے ان کا فلسفہ خودی— اقبال سے پہلے شعرا صرف فنافی اللہ یعنی ''نفی خودی'' کے قائل تھے وہ لوگ بیشتر فلسفہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود نیز فلسفۂ جبر و قدر میں الجھے ہوئے تھے۔لوگوں نے حقوق کے اس دامن کو پکڑا ہوا تھا جس نے انھیں بے عمل بنا کر رکھ دیا تھا۔لیکن علامہ اقبال نے سب سے پہلے اس روایت کے خلاف نعرہ بلند کیا۔انھوں نے بتایا کہ انسان کی زندگی کا صرف اور واحد مقصد فنافی اللہ نہیں بلکہ اس کی بقا ہے۔انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی انا (خودی) کو مجروح نہ کرے، چناں چہ اسرار خودی کے دیباچے میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ:

''انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین اثبات خودی ہے نفی خودی نہیں۔''

اس کے علاوہ نکولسن (Nicholson) کی خواہش پر بھی علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی وضاحت کی تھی۔وہ کہتے ہیں،

''حیات تمام و کمال انفرادی حیثیت رکھتی ہے، نیز موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ایسی کوئی بھی چیز موجود نہیں جسے حیات کلی سے منسوب کر سکیں۔خدا بھی ایک فرد ہے۔لیکن ایسا فرد جس کا کوئی عدیل و نظیر نہیں کائنات افراد کے مجموعے کا نام ہے مگر اس مجموعے میں جو ترتیب و نظم دیکھی جاتی ہے وہ مکمل نہیں۔کائنات تدریجی مراتب طے کر رہی ہے ہنوز مکمل نہیں ہوئی۔''

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی دمادم صدائے کن فیکون

انسان بھی تخلیقی کاموں میں حصہ لیتا ہے۔اس کا اشارہ قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔تبارک اللہ احسن الخالقین، اور علامہ اقبال نے اس

کی وضاحت مندرجہ اشعار میں اس طرح کی:

تو شبِ آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و زاغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت مگر با ایزد انباز است آدم

المختصر یہ کہ اقبال کی نظر میں انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی ذات میں جذب ہو جانا نہیں ہے بلکہ اپنی انفرادیت قائم رکھنا ہے۔

اقبال کے نزدیک منفرد، بے نظیر اور مکمل ذات اللہ کی ذات ہے۔ انسان کے سامنے اعلیٰ ترین نمونہ اللہ کی ذات ہے۔ اس لیے انسان جب اللہ کا عاشق و شیدا ہے تو یہ لازم ہے کہ اس کی خوبیاں اپنائے انسان اس طرح انسان کامل بن سکتا ہے۔ چناں چہ اقبال نے مرد کامل یا مسلمان بننے کے لیے جو شرائط پیش کیے ہیں میں ان میں مندرجہ ذیل چار عناصر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اور کبھی کبھی اقبال خودی کی سطح کو اتنا بلند کرنے کے لیے بھی کہتے ہیں کہ خود شان خداوندی اور رحمت ایزدی اس بات کی خواہش کرے کہ بندہ اس سے کچھ طلب کرے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اسی طرح اقبال فلسفہ ہے خودی ان کی شاعری کا ایک منفرد اور اہم ترین موضوع ہے۔ بظاہر ہے خودی خودی کی ضد معلوم ہوتی ہے مگر یہ خودی کی ضد نہیں بلکہ اس کا تتمہ ہے۔ اسے اجتماعی خودی کا بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ دراصل حد سے بڑھی ہوئی خودی یا وہ خودی جو بے اعتدالی کا شکار ہو جاتی ہے وہ فرد اور قوم و ملت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

اس لیے اقبال نے خودی کو زیادہ محکم کرنے کے لیے اور اسے بے اعتدالی سے بچانے کے لیے خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ اس کی مثال آپ اس طرح لے لیں کہ اگر کسی دریا کا پاٹ چوڑا ہو تو دریا کی روانی میں فرق آ جائے گا۔ اس لیے اسے حد میں رکھنے سے اس کی روانی اور اس کا زور بڑھ جائے گا۔ اقبال کے پیش نظر بھی یہی حکمت ہے اور اسی لیے اقبال نے فلسفہ خودی پیش کیا۔ دراصل دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد را ربط جماعت است

جوہر اور اکمال از ملّت است

علامہ اقبال کا فلسفۂ عشق بھی اردو کی روایتی شاعری سے یکسر مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی ترقی میں جو چیز انسان کو ابھارتی ہے اور اسے دعوت عمل دیتی ہے اس کا نام عشق ہے اقبال کے نزدیک عشق صرف ایک جنسی جذبے یا ہیجانی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عشق ہی عمل کا سرچشمہ اور زندگی کا دوسرا نام ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبد

عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال حیات بعد ممات کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جسم اور روح مادے اور توانائی کی حیثیت رکھتے ہیں جو صرف شکلیں بدلتی ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی شکل میں اپنے وجود کو قائم رکھتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی روحانی وجود قائم رہتا ہے۔ انسانی وجود کا مرکز اس کی روح ہے جو ذات خداوندی کی طرح لافانی اور لازوال ہے۔ اقبال کے نزدیک موت صرف عالم معنی کا سفر ہے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شئے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

شاعر مشرق نے مغربی نظام کا بھی بڑا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ اس نظام میں انھیں بہت ساری خامیاں اور نقائص نظر آئے ان پر کڑی تنقید بھی کی۔ اقبال نے دیکھا کہ مغرب جمہوریت کی آڑ میں کمزور اور چھوٹی قوموں پر مظالم ڈھا رہا ہے۔ جمہوریت کے روپ میں ''دیو استبداد'' پائے کوبی میں مصروف ہے اور کمزور اور بھولے بھالے لوگ اسے ''آزادی کی نیلم پری'' سمجھتے ہیں اور اقبال کو اس ذاتی اور عملی تجربہ بھی ہوا تھا۔ وہ ایک بار پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر بھی چنے گئے تھے۔ انھوں نے کونسل ہال میں جو نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ارباب غرض نے صوبے بھر سے اَن پڑھ اور بنیے جمع کر رکھے تھے۔ وہ اونگھا کرتے تھے۔ کچھ بھی کیا خاک جب رائے مانگی جاتی تو ہاتھ اٹھا دیتے۔ اقبال پانچ سال تک یہ تماشا دیکھتے اور کڑھتے رہے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اقبال یا آئن اسٹائن جیسے مفکر کی حیثیت وہاں جمعراتی یا کلو میاں سے زیادہ نہیں۔ آخر علامہ اقبال نے توبہ کی اور پھر کبھی انتخاب میں کھڑے نہیں ہوئے۔ اقبال نے جمہوری نظام میں ملوکیت کی روح دیکھی تھی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہاں قابلیت سے زیادہ مقبولیت یا شہرت شمار ہوتی ہے۔ آخر کار وہ یہ کہہ اٹھے:

گریز از طرز جمہوری خلا سے پختہ کاری شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نجمی آید

وہ اس نام نہاد جمہوریت کا ''پول'' خود ایک فرنگی سے کھلواتے ہیں:

اس راز کو ایک مرد فرنگی نے کیا فاش — ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

علامہ اقبال اشتراکیت اور جمہوریت کو دہریت اور مادیت کی بیٹیاں تصور کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام نظاموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔'' اقبال نے یہ نظریہ صرف اسلامی جذبے سے متاثر ہو کر پیش نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسلامی نظام کا سائنٹفک مطالعہ کیا تھا۔

ان نئے فلسفیانہ نظریوں اور دیگر نئے موضوعات کے علاوہ علامہ اقبال نے نئی نئی علامتوں کو بھی بطور احسن پیش کیا۔ نیز انھوں نے پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم کے جامے پہنائے اور ان علامتوں کو نئے معنوں میں اور نئے طریقے سے پیش کیا، گل و بلبل، قمری و سرو، شمع و پروانہ چمن و صحن چمن لالہ و غنچہ، عشق و محبت اور اس طرح کے صدہا الفاظ جو ہماری شاعری میں استعمال ہوتے تھے ان کو اقبال نے نئے مفہوم و معنی عطا کیے مثال کے طور پر میر کا اپنا شعر دیکھیے جس میں لفظ بلبل کا استعمال ہوا ہے۔

کرتی پھرے ہے رسوا سارے چمن میں مجھ کو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے

اب اقبال کے اس شعر میں بلبل کا استعمال دیکھیے، اقبال کے یہاں بلبل ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

خروش آموز بلبل ہو گرہِ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے باد بہاری ہے

یہاں بلبل چہکنے یا گانے والا پرندہ نہیں بلکہ خود شاعر کی ذات یعنی شاعر ہے جو ملت اسلامیہ میں روح پھونکنا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اقبال کے یہاں اور بھی علامتیں اور تصورات ملتی ہیں مثلاً شاہین، شہباز، کی علامتیں، مومن، قلندر اور رند کے تصورات غرضیکہ انھوں نے اردو شاعری کو بہت سی نئی اور جدید علامتوں، استعاروں اور تصورات سے روشناس کرایا جو نہ صرف ان کی شاعرانہ عظمت پر دال ہیں بلکہ انکی جدت پسند طبیعت کی بھی غمازی کرتی ہیں اس طرح ہم اگر اقبال کو اردو شاعری میں ایک نئی آواز سے موسوم کریں تو ہرگز نامناسب نہیں ہوگا۔

نسیم انجم

علامہ اقبال عظیم شاعر، عظیم مفکر

ڈاکٹر علامہ اقبال فلسفی، حکیم الامت، مجتہد، مفکر اور قومی لیڈر کی حیثیت سے دنیائے علم و ادب میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ علامہ کو اسلام سے سچا عشق تھا، قرآنی تعلیم و افکار ان کی شاعری اور تقریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اقبال ہر روز پابندی سے قرآنِ حکیم اور اس کا ترجمہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے والد بزرگوار نور محمد نے اپنے لائق فائق بیٹے سے کہا کہ برخوردار جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو یہ خیال رکھو کہ گویا، یہ قرآنِ کریم جو کہ ہدایت کا سرچشمہ ہے، تم پر نازل ہوا ہے اور اللہ تم سے ہی ہم کلام ہے۔ اس خیال کو اقبال نے اپنے شعر میں اس طرح قلم بند کیا ہے:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

علامہ اقبال نہ صرف موجودہ زمانے کے بلکہ بہت سے گزشتہ ادوار شاعری میں جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اتنا بلند پایہ کا شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا، علامہ جیسا بلند مرتبت شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ کسی مفکر نے ان کی شاعری کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ علامہ کی شاعری میں حافظ کا سوز، عمر خیام کی بے باکی اور غالب کی خودداری پنہاں ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ مشرق نے ہی نہیں بلکہ مغرب نے بھی اس پائے کی شاعری کا نمونہ پیش نہیں کیا۔

علامہ اقبال نے مشرق و مغرب کے فلسفوں کا گہرا تقابلی مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں کیا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی فکر و ادراک کی حدیں وسیع تر ہوتی گئیں، ان کا خیال تھا کہ اسلامی ثقافت کی روح کو نسلی عصبیت کے خس و خاشاک سے پاک کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک دورِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگینوں کی ریزہ کاری ہے

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خودغرضی، ناشکیبائی، ہوسناکی

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا مشن کالج لاہور سے کی، اپنے پہلے مشاعرے میں جو انھوں نے نظم پڑھی تھی اس نظم کے اس شعر نے قدر دانوں سے بے حد داد و تحسین حاصل کی۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

علامہ کی تخلیقات ندرت خیال، شاعرانہ وسعت اور فکر انگیزی سے پُر ہے ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والا سوتے سے بیدار ہو جاتا ہے۔ علامہ کا پیغامِ خودی اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے، اس کی اسلامی حمیت، ملی غیرت بیدار ہو جاتی ہے، وہ نوجوانوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے، جوانوں کی تن آسانی

علامہ کا خاندان اپنے علم و دانش کی وجہ سے بے حد معتبر اور باعزت سمجھا جاتا تھا، انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس بات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

ہے جس گھر کا چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

اپنے دور کے رواج کے مطابق علامہ اقبال نے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے اپنی علمیت اور قابلیت کی بنا پر انھیں مڈل اور ہائی اسکول کے امتحانوں میں وظیفے ملے۔ تھوڑے عرصے بعد شمس العلما سید میر حسن سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اقبال نے اپنی نظم ''التجائے مسافر'' میں اپنے استاد سے عقیدت محبت اور اعترافِ کمال کو شاعرانہ وصف اس طرح عطا کیا ہے:

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

علامہ نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں کامیاب طلبا میں شرف اولیت حاصل کیا، یہ ہی وہ دور ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر سر طامس آرنلڈ جو کہ تاریخ اسلام اور فلسفے کے عالم تھے ان کی قابلیت و لیاقت سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر آرنلڈ کو علامہ علمی قابلیت اور آگے بڑھنے کے شوق اور اپنے علمی و تحقیقی کاموں کی وجہ سے بے حد عزیز تھے، شاگرد اور استاد میں محبت و احترام کا یہ عالم تھا کہ جب ڈاکٹر آرنلڈ انگلستان چلے گئے، تب علامہ نے استاد کی جدائی میں اپنی ایک نظم ''فراق'' کے عنوان سے لکھی وہ اپنے استاد کو اس طرح

مخاطب کرتے ہیں:

تو کہاں ہے اے کلیم ذرد سینائے علم
تھی تری موج نفس بادشاہ افزائے علم

اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
ترے دم سے تھا ہمارے سر میں سودائے علم

اقبال نے عالم رنگ و بو کے تمام رنگوں کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے انھوں نے فطرت اور قدرتی مناظر سے بے حد پیار تھا اسی لیے قدرت کی صناعی کو انھوں نے اپنی شاعری میں دلکش انداز میں ڈھالا ہے۔ ہمالہ کا منظر علامہ اقبال نے بے حد خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اور اس کی وسعت اور شان وشوکت برفیلی چوٹیوں کی دل آویز تصویریں شاعری کی شکل میں دکھائی ہیں:

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر پر
خندہ زنی ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں بھی علامہ کی شاعری کی اپنی جداگانہ حیثیت ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری میں تنقید نمایاں ہے، ان کے ہاں تہذیب پر گہرا طنز اور واعظ و ملا کے بے عمل اور ریاکارانہ و منافقانہ کردار پر بڑی تند و تیز تنقید نظر آتی ہے، وہ مغرب کی کھوکھلی اقدار پر وہ طنز کے نشتر بے حد فن کاری سے چلاتے ہیں:

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

مہ خانہ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں سرداب آخر

اقبال کو ملتِ اسلامیہ سے محبت ہی نہیں بلکہ والہانہ عشق ہے۔ اسی زمانے کے فارسی کلام ان کے یہاں میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اسلامی تعلیمات کا عکس موجود ہے۔ خودی اقبال کی تعلیمات کی روح ہے، اقبال کی خودی کی تکمیل قرآنی علم اور اس کے احکامات کے مطابق ہوتی ہے، اقبال کے نزدیک خودی تین حالتوں سے گزرنے کا نام ہے۔

۱۔ اطاعتِ خداوندی
۲۔ نفس پر قابو پانا

۳۔ نیابتِ الٰہی

یقیناً تینوں اوصاف پر عمل کر کے بندہ مومن دنیا سے بدی کا خاتمہ کر سکتا ہے، نیکیوں کی روشنی سے جہالت، گمراہی، ناانصافی، بددیانتی اقربا پروری اور دوسری بہت سی برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے اللہ کے احکامات کو ماننے والا اس پر عمل کرنے والا دین و دنیا میں سرخرو ہوتا ہے۔ درج ذیل اشعار میں خودی کی تعلیم کو دردمندی اور خوبصورتی کے ساتھ سمو گیا ہے:

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

یا پھر یہ شعر:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

اقبال کی شاعری رفعتِ تخیل، متانت، شگفتگی و برجستگی سے پُر ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اہل علم و حکمت نے فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی بامقصد، پرتاثیر شاعری کو ان کی زندگی میں بھی سراہا گیا اور قدر کی گئی اور بعد از مرگ بھی۔ علامہ اقبال کی وفات پر ان کے استاد ڈاکٹر مسٹر طامس آرنلڈ نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا کہ ''ڈاکٹر اقبال محض دوسروں کے خیالات کی بازگشت نہیں تھے، ان کا مطالعہ اور استفادہ بے حد وسیع تھا وہ واضح طور پر ایک عظیم مفکر تھے۔ مصر کے مشہور عالم اور دانش مند ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اقبال کو مصر کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر ابوالمعلیٰ کا ہم مرتبہ قرار دیا بقول ان کے دونوں عظیم فلسفی اور شاعر تھے، دونوں تصوف کے اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچ گئے تھے۔ جامعہ استنبول کے ایک ممتاز پروفیسر علی نہاد طرلون (Tarlon) نے اقبال کو پچھلی صدی کے عالمِ اسلام کا ہی نہیں بلکہ پورے مشرق کا سب سے عظیم مفکر اور شاعر قرار دیا ہے۔

بے شک اقبال جیسی عظیم ہستیاں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ ان کا تخلیق کردہ شعر ان کی زندگی اور شخصیت پر پورا اترتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال کا فلسفہ عقل و عشق

ارم سحر آفتاب

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

ہر بڑے آدمی کا نام ایک طلسم ہے جسے زبان پر لاتے ہی نظر کے سامنے نیا جہاں ابھر آتا ہے...

عالمی ادب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو بہت کم شعرا ایسے ہیں جو شاعری کی قدر و قیمت کے بارے میں متضاد جذبات رکھتے ہیں اور علامہ اقبال کا شمار ان غیر معمولی شعرا میں ہوتا ہے ان میں شاعری کا ملکہ اور شاعری کا عشق دونوں بدرجہ اتم موجود تھا۔ شاعری کا جواز ان کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے ماورا کسی بڑے مقصد کا وسیلہ ہے۔ اس بڑے مقصد کی پردہ کشائی اقبال کی شاعری کی ایک بنیادی کوشش ہے۔ شاعری نے اقبال کے لیے ایک مقصودِ بالذات سرگرمی کی حیثیت حاصل کر لی۔ فطری اعتبار سے شاعری اقبال کے نزدیک زندگی کی تخلیقی اور ارتقائی قوتوں کا ایک وجدانی اظہار ہے بلکہ ان قوتوں میں سے خود ایک قوت اور طاقت ہے۔ عملی طور پر شاعری اقبال کے لیے زندگی کی شریکِ حیات ہے کیوں کہ جس طرح زندگی خودی کے اثبات اور اس کی کارفرمائی کا نام ہے۔ اسی طرح شاعری نہ صرف خودی کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے بلکہ اس کی تشکیل کا ایک ذریعہ بھی ہے شاعر جس کی ہستی ہمہ تن سوز و ساز اور تب و تاب ہوتی ہے اپنی خودی کی روح ملت کے جسم میں پھونک کر اسے نئی زندگی عطا کرتا ہے اور اقبال نے شاعر میں نئی روح پھونکی ہے... قدرت کی طرف سے ان کو جو صلاحیتیں اور فطانت ملی تھیں وہ عمق کے ساتھ ہمہ گیری لیے ہوئے تھیں۔

اقبال کے یہاں حسن و جمال، سوز اور تڑپ کے ساتھ ان کی شاعری کے موضوعات میں سیاسی، سماجی، معاشی اور زندگی و حیات کے موضوعات اور نظریات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ وہ فلسفہ و تاریخ اور ادبیات کے متبحر عالم اور باکمال استاد تھے یونان کو کئی زبانوں پر فاضلانہ دسترس حاصل تھی لیکن عربی، فارسی اور اردو کے وہ عالم تھے۔ مزید برآں مشرق و مغرب کی کئی دوسری زبانوں سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے موجودہ مشرقی شاعروں اور فلسفہ دانوں کے کہکشاں میں اقبال کی انفرادیت سب سے زیادہ درخشاں اور ضوفگن سیارہ

کی سی ہے۔

ان کی ذہنی تخلیقات اور تصانیف نے گہرائی اور فکر انگیزی نے موجودہ شاعری کے انداز پر حیرت انگیز اثر ڈالا ہے۔ شاعرانہ وسعت نظر اور ندرتِ خیال کے بانی اور خالق ہونے کی بنا پر وہ حیاتِ انسانی اور اسرارِ قدرت کا مطالعہ بھرپور تخیلی محویت سے کرتے تھے ان کی شاعری میں جوش اور ولولہ کا زور موجود ہے جس سے انھوں نے دنیائے فکر و عمل میں انقلابی اور ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔

ان کے کلام میں ایسی روح کارفرما ہے جو قوموں کو غفلت سے بیدار کرتی ہے۔ ان کی خوابیدہ دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرسکتی ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ حکومت اور معاشرہ کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی قوت بھی رکھتی ہے ان کی شاعری اپنی مثال آپ ہے اس میں ندرت، زور آفرینی، ولولہ انگیزی، اور اعادہ حیات کی سحر کاریاں موجود ہیں۔

بقول پروفیسر حمید احمد خاں:

> ''اقبال کا کلام بہ اعتبار شاعری قرن اول کے بہترین محرکات و عوامل کا گنجینہ دار اور بہ لحاظ پیغمبری ہماری آنے والی زندگی کی شاہراہوں پر چمکنے والا نور حقیقت ہے سچ تو یہ ہے کہ ہماری نیم مردہ قوم کی رگوں میں ایک مدت کے بعد اقبال کی آتش نفسی نے خونِ حیات دوڑایا ہے۔''

عظیم مغربی نقاد سیموئل ٹیلر کالرج کا قول ہے کہ:

> کوئی شخص بھی شاعری میں عظمت کا حامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ عظیم فلسفی نہ ہو۔

اگر اقبال کے مجموعی کلام کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ان کے کلام میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے ان کی شاعری کو فلسفیانہ شاعری کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے فلسفۂ حیات کے مختلف مدرسہ ہائے فکر کا، جس میں قدیم و جدید دونوں شامل ہیں بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور حقیقی دنیا کے مسائل کا حل اور نظریہ پیش کیا۔ ان کی شاعری کو آب حیات کا خزانہ قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیراب ہوکر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اقبال کو ایک غیر معمولی اور نہایت نادر فہم و ذکا عطا ہوا تھا اس لیے حقیقت کی تہ تک اس کی تخیل اور بصیرت کی رسائی ہو جاتی ہے اسے عشق اور خداشناس نظر کے اوصاف فطری طور پر حاصل ہیں۔ جنھیں ایک ایسی روحانی قوت، کہا جاسکتا ہے۔ جو ایمان، پاکیزگی، محبت اور شعور کے اثرات سے فروغ پاتی ہے۔ اس قوت کی بدولت ان کی نظر ''لامحدود'' تک پہنچ کر عالمِ نامعلوم میں داخل ہونے کی جرات کر سکتی ہے وہ ہمہ گیر مشاہدہ کرتی ہے۔ اس لیے اس کی شاعری کو آمد اور خداداد جذبات کے ابھار اور بہاؤ کا نتیجہ کہنا چاہیے۔

اقبال کی شاعری کے موضوعات کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے انھوں نے اپنی شاعری میں فلسفہ، فکر، خودی و بے خودی، عظمت، نظریہ فن جیسے موضوعات کو شامل کیا۔ ان کی شاعری حیات اسرار و رموز کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک نظریے کی جستجو کرتے ہیں۔ جو کے دل اور روح کو منور کردیتی ہے:

قافلہ تیرا رواں ہے منتِ بانگ درا
گوشِ انسان نہیں پا سکتا تیری آواز پا

ساتھ اے سیارہ ثابت نما لے چل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے

اقبال کے یہاں ''عشق'' اور ان کے مترادفات ولوازمات یعنی وجدان، خودآگہی، باطنی شعور، جذب، جنون، دل، محبت، شوق، آرزومند، درد، سوز، جستجو، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، تواتر، انہماک اور شدت احساس کے ساتھ ملتا ہے کسی اور موضوع کا نہیں ملتا۔ ان کے اردو فارسی کلام میں شاید ہی کوئی غزل یا نظم ہو جس میں ان الفاظ کے حوالے سے بات نہ کہی گئی ہو اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اقبال کے نظامِ فکر وفن میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، اور اس اہمیت کو نظر انداز کر کے کوئی شخص ان کے فلسفہ حیات سے بہرہ مند اور ان کی شاعری سے لطف اندوزی کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اقبال کے نزدیک عشق عطیۂ الٰہی اور نعمتِ ازلی ہے... اور یہ ہی نعمت اس کائنات کی تخلیق و تسخیر میں انسان کو جذبۂ عشق سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو لفظ ''عشق'' کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوشِ وجدان ہے جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی ہی بدولت انسان تکمیلِ ذات کے لیے جذب وتسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے۔ جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذب کلی ہے۔ اقبال کا عشق ہمارے دوسرے شعرا کے نام نہاد رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ عشق کو وہ زندگی کا زبردست محرکِ عمل بتاتے ہیں۔ اسی کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمت مردانہ کے سامنے جبریل کو ''صیدِ زبوں'' سمجھنے لگتا ہے اور اپنے وجدان کی کمند سے ذات یزداں پر قابو پانے کے منصوبے سوچتا ہے:

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آورائے ہمت مردانہ

ہے کہ جیسے کوئی ''فوق البشر'' شعر کی زبان میں دنیا والوں سے خطاب کر رہا ہو... اس کی بے نیازی اور جرأت ذرا ملاحظہ ہو:

یمِ عشق کشتی من، یم عشق ساحل من
نہ غمِ سفینہ دارم نہ سر کرانہ دارم

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا ذہن اور اس کی روح عشق سے لبریز ہے ابدی عشق کے کارگر اور کارساز ہونے پر اسے یقین ہے ان کے نزدیک عشق زندگی ہے اور زندگی عشق:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

تندو سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا تھام

(بالِ جبریل)

وہ محبت یا جذبۂ عشق جو اقبال کے دائرہ فکر وفن کا مرکزی خاصہ ہے۔ یہ ہی تخلیقِ کائنات سے لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت، آشنا اور کارِ رازِ حیات میں انسان کا راہنما ہے اقبال کچھ یوں کہتے ہیں کہ:

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں خموشاں ہیچ نمونمائے نداشت

یعنی۔

کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے ورنہ اس سے پہلے اس کائنات کی فضا بے جان اور بے کیف تھی۔

عشق کا ہر وہ عملی پہلو جو اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی زندگی میں کارگر بنانے کا نہایت موثر وسیلہ ہے اور اسی کے سبب وہ اسرارِ خودی لے کر جاوید نامے تک برابر اس سے اپنے جذبے پرستاری کا اظہار اس طور پر کرتے ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن، ماممکن است

(اسرارِ خودی)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتِ کدۂ تصورات

(بالِ جبریل)

اقبال کے نظریۂ عشق کے بارے میں ڈاکٹر یوسف خاں کچھ یوں فرماتے ہیں کہ:

''اقبال کا تصورِ عشق دوسرے شعرا کے متصوفانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ عشق ان کے یہاں زندگی کا ایک زبردست محرکِ عمل ہے جو ایک طرف تسخیر فطرت میں انسان کی مدد کرتا ہے اور دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحد رکھتا ہے۔''

اقبال کا عشق کے نظریے میں ایک کچھ یوں ہے کہ عشق کی بدولت آدمی میں حریت و آزادی کا ایسا شدید اور طاقتور احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ساری مادی اور خارجی بندشیں اس کی نظر میں کمزور اور بے وقعت ہو جاتی ہیں باطنی شعور ذہن پر حقائق کے راز اس طرح فاش

کرتی ہے ذہنی علوم یعنی عقل وحکمت اس کے غلام بن جاتے ہیں:

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امام من عقل است غلامِ من

(زبورِعجم)

قافلۂ حیات کی ساری ہماہمی اسی کی (عشق کی) بدولت ہے اور اسی کے حلقۂ دام میں آ کر زندگی کو ذوقِ تمنا نصیب ہوتی ہے:

جاں در عدم آسودۂ بے ذوقِ تمنا بود
مستانہ نواہا در حلقۂ دام من

(زبورعجم)

بیان کردہ ہر لفظ قلبی واردات کا آئینہ دار ہے یہ خیال کہ ''عشق کی بدولت روحِ انسانی کو دوام نصیب ہوتا ہے'' جدید فلسفے کا ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے کہ عشق ہی زندگی کا سب سے بڑا محرکِ تخلیق ہے۔

عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے اس کے جذب وتمنا کی سعی وجہد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ عشق ایک زبردست محرکِ شعری ہے وہ جذباتِ انسانی کا سرتاج ہے۔ اس کی وارداتِ قلبی عالم گیر ہے۔ یہ محرکِ شعری دنیا کی ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ ہے:

مولانا روم کے زمانے سے لے کر اب تک ہمارے شعرا نے عشق کو عقل وعلم کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے جب کہ اقبال نے اس کے برعکس کیا، انھوں نے عشق کو عقل کے مقابلے میں فضیلت دی ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے حقائقِ زندگی کا مکمل علم و بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اقبال نے عشق اور عقل کے موضوعات کو اپنے فلسفۂ حیات کے آلۂ کار کے طور پر بہت بعد میں استعمال کیا لیکن بیشتر فلسفیوں اور صوفیوں کی طرح وہ بھی شروع ہی سے عقل وعشق کی برتری کا احساس وعقیدہ رکھتے تھے۔

عشق کی طرح عقل وعشق کا تقابل بھی اقبال کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس سلسلے میں ان کی نکتہ آفرینیاں اپنے پیش رو صوفیوں اور شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ عقل ایک خداداد نعمت ہے لیکن اس کے کچھ حدود ہیں ان حدود کے باہر اس کے دعوے لاحاصل اور لایعنی ہو جاتے ہیں اس کی رسائی صرف خارجی دنیا ہے اور صرف انھیں اشیا کا ادراک اس کے بس کی بات ہے جو حواس خمسہ کی دسترس میں ہے۔ نتیجتاً حقیقت شناسی سے محروم رہتی ہے اس کے برعکس عشق چون وچرا وسود وزیاں کے الجھاؤ میں خود کو نہیں ڈالتا جو کرنا ہے کر گزرتا ہے اور یقین کو رہنمائی میں اصل حقائق تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔ عشق کی مردانگی اور عقل کی گمراہیوں اور نارسائیوں کا ذکر اقبال کے یہاں اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ شاید ہی کسی اور موضوع کا ذکر اتنی کثرت سے ہو۔ فلسفۂ خودی و بے خودی سے لے کر فقر وقلندری اور جہاں کشائی و جہاں بانی تک شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس کی تشریح وتفہیم میں عقل وعشق یا ان کے

مترادفات سے مدد نہ لی گئی ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک نظم ''عقل و دل'' کے نام سے تحریر کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال کو اس اندازِ فکر سے طبعاً لگاؤ تھا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی — مظہر شانِ کبریا ہوں میں
دل سن کر کہا کہ سب کچھ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مرا مقام — عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

(بانگِ درا)

بعد میں عقل و دل کے امتیازات کا یہ ہی احساس اقبال کے فلسفۂ خودی کا آلہ کار بن گیا اور اقبال نے جہاں کہیں عشق کی کار آفرینیوں کا ذکر کیا ہے عموماً عقل کی نارسائیوں کے حوالے سے کیا ہے گویا جس طرح نیکی کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے بدی کا روشنی کے سلسلے میں تاریکی کا ذکر کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب و بام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اسی طرح ایک جگہ یوں فرماتے ہیں کہ:

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق پہ کھویا گیا یہ فرزانہ

عشق کے جنونِ تخلیق پر اگر عقل کی روک نہ رہے تو انسانی معاملے درہم برہم ہو جائیں۔ چناں چہ جنون کی حالت میں گریباں چاک کرنا تو بہت آسان ہے لیکن یہ دشوار ہے کہ جنون بھی ہو اور گریباں بھی سلامت رہے۔ دراصل یہ ہی عشق و عقل کا امتزاج ہے جو انسانی عمل کو سعادت کی راہ پر لے جاتا ہے اقبال نے اسی مسلک کی حمایت کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی خالص نکھری ہوئی شکل میں عشق و عقل دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عقل بھی انسان کو منزل مقصود تک لے جاتی ہے اور عشق بھی۔ لیکن دونوں کے طریقوں میں فرق ہے، عقل حیلے بہانوں و حوالے سے منزل طے کراتی ہے اور عشق میں خود اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ کشاں کشاں قافلۂ حیات کو منزل کی طرف تیز گام لے جا سکتا ہے۔ اس خیال کو اقبال نے نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے:

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال عقل کو انسانی کی خدمت کا ایک وسیلہ خیال کرتے ہیں۔

افلاطون نے عشق کی حقیقت کو کچھ انداز میں بیان کیا ہے کہ:

''عشق وہ قوت ہے جو عالمِ کون و فساد میں ربط و نظم قائم کرتی ہے یہ ہی جذبہ انسان کے دل میں جب جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کو حیاتِ جاودانی بخشتا ہے۔''

اقبال نے اسی خیال کو نہایت لطیف انداز میں اپنی نظم ''محبت'' میں سمونے کی کوشش کی ہے یہ نظم فن کے نقطۂ نظر سے نہایت مکمل ہے اس میں وہ کائنات کی ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچتا ہے جب کہ آسمان کے ستارے بے لذتِ گردش سے ناآشنا تھے اور عروسِ شب کی زلفیں پیچ و خم سے ناواقف تھیں اور نظم ہستی پوری طرح قائم نہ ہوا تھا نظم ''محبت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
کمالِ نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

عشق و عقل کے نظریات میں اقبال اور دوسرے شعرا کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ علم و عقل کو اوروں کی طرح یکسر، بے وقعت اور بے معنیٰ خیال نہیں کرتے بلکہ ان کا زاویہ فکر صرف یہ ہے کہ حقائق کی کتاب کشائی میں عشق بمقابلہ عقل زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً انسانی زندگی کی مادی ترقی میں علم و عقل کی رہنمائیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ البتہ روحانی ترقی جسے اقبال حیاتِ انسانی کا اصل مقصود جانتے ہیں۔ عشق کی رہبری کی محتاج ہے اور اس میں اقبال عقل و علم کو بے دست و پا خیال کرتے ہیں انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

برگساں کے فلسفۂ ابہام پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

''جسے عشق یا جنون کہا جاتا ہے وہ دراصل عقل ہی کی حد درجہ ترقی یافتہ صورت ہے۔''

ایک جگہ اقبال یوں لکھتے ہیں کہ:

''عقل و عشق میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے بلکہ عقل جب سوز سے ہم کنار ہو جاتی ہے تو عشق بن جاتی ہے۔''

اقبال کے نزدیک دانش یا علم کی دو قسمیں ہیں ایک دانش برہانی اور دوسرا دانش شیطانی۔ اگر علم و عقل، باطنی شعور سے آگاہ نہ ہو اور صرف جسم پروری کے کام کر رہے ہوں تو یہ دانش شیطانی ہے۔ اس کے برعکس اگر روحانی حقائق سے آشنا ہو اور منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر کے انسان کے دل میں اعلیٰ مقاصد کے لیے آرزو پیدا کرتے ہوں تو یہ دانش برہانی ہے اور اسی دانش برہانی کا دوسرا نام عشق ہے:

علمِ تفسیر جہاں رنگ و بو
دیدہ و دل پرورش گرد دازو

علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود ہم جادہ ہم راہبر

اقبال کا تصورِ عشق اردو فارسی کے دوسرے شعرا یے یکسر مختلف ہے ان کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان، جنسی خواہش، حواس باختہ ازخود رفتگی، فنا آمادگی یا خود کو محدود میں گم کر دینے کا نام نہیں بلکہ ان کے یہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوتِ حیات کا، جذبۂ عمل سے سرشاری کا، حصولِ مقصد کے لیے بے پناہ لگن کا عزم و آرزو سے آراستہ جہد مسلسل کا:

عشق کی گرمی سے معرکۂ کائنات
علمِ مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عش ہے پنہاں جواب

کتابیات:

(۱) ''اقبال سب کے لیے''، از فرمان فتح پوری، شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی یونی ورسٹی
(۲) ''دانائے راز'' (اقبال کی شاعری و فلسفہ پر ایک نظر) از پروفیسر ضیاالدین احمد، غضنفر اکیڈمی، کراچی، پاکستان
(۳) ''اقبال شخصیت اور شاعری'' (مجموعہ مقالات) از پروفیسر حمید احمد خاں
(۴) سہ ماہی جریدہ ''اردو''، اقبال نمبر ۱۹۳۸ء، انجمن ترقی اردو پاکستان
(۵) ''نقوش'' اقبال نمبر
(۶) ''نگارِ پاکستان'' اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء

خصوصی طور سے منتخب کردہ مضمون

ڈاکٹر وزیر آغا

اقبال — جدید اردو نظم کا پیش رَو

آج سے کم و بیش ساٹھ برس پہلے جدید اردو نظم ایک شجرِ ممنوعہ کا درجہ رکھتی تھی اور ہمارے ثقہ بزرگ اور شاعری کے قدیم رنگ کے رسیا حضرات اس سے پوری طرح بدکتے تھے۔ چناں چہ وہ راشد، میراجی، فیض اور ان سے متاثر ہونے والوں کی شاعری کو بے راہ روی، توڑ پھوڑ اور مجہول انفرادیت کی شاعری کہہ کر مسترد کر دیتے تھے لیکن اتنے برس گزر جانے کے بعد اب صاف محسوس ہونے لگا ہے کہ جدید اردو نظم متوازی مغربی تحریکوں سے متاثر ہونے کے باوصف ایک بڑی حد تک اقبال کی اجتہادی روش اور رویے سے متاثر تھی لہٰذا اس پر بے راہ روی اور انتشار کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ احساس کس حد تک حق بجانب ہے۔ جدید اردو نظم پر اقبال کے اثرات کا اندازہ کرنے کے لیے اُن دو بنیادی نظریوں پر غور کرنا ضروری ہے جو اقبال کے زمانے میں عام ہو چکے تھے اور جن نے اقبال کا ذہنی نظام ایک بڑی حد تک مرتب ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نظریہ حالی کا تھا۔ حالی نے قوم کی زبوں حالی کے پیشِ نظر اسلاف کے کارناموں کو بڑی اہمیت دی تھی اور ماضی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر کے حال کو بہتر بنانے پر عوام کو مائل کیا تھا۔ اقبال نے اسلاف کی بلند اخلاقی سطح کا یہ تصور حالی سے اخذ کیا اور آگے چل کر جب انھوں نے اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج میں حصہ لیا تو ان کے اس میلان میں مسدس حالی کی گونج برابر سنائی دیتی رہی۔ دوسرا نظریہ اکبر کا تھا۔ اکبر مغربی تہذیب کی تقلید کے خلاف تھے۔ ان کی اس نفرت کے پس پشت یہ احساس نہایت قوی تھا کہ کہیں ان کی قوم مغربی تہذیب کو اپنا کر تنزل اور زوال کا شکار نہ ہو جائے۔ اپنی قوم کو مغربی تہذیب سے محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کے حربوں کو عام طور سے استعمال کیا۔ اقبال نے سفرِ یورپ کے بعد ردِ عمل کے طور پر اس طریق کو اپنایا لیکن ابتدا ہی میں اکبر کے تتبع میں نظمیں لکھنے کی روش صاف طور پر اس بات کی غماز ہے کہ اس ردِ عمل کی تعمیر میں اکبر کے اثرات نے بنیادی کام سرانجام دیا تھا۔ تاہم اقبال نے بہت جلد اکبر کے طنزیہ طریق کار کو ترک کر دیا اور ایک علمی اور نظریاتی سطح پر مغربی تہذیب کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ حالی اور اکبر مختلف الخیال ہونے کے باوجود ایک ہی اعلیٰ مقصد کے لیے کوشاں تھے۔ یعنی اصلاح کے ذریعے قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کا مقصد! یہ الگ بات ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے حالی نے مثبت اور اکبر نے منفی طریق اختیار کیا لیکن جہاں تک اقبال کا تعلق ہے انھوں نے اسلاف کی عظمت کا تصور تو حالی سے اور مغربی تہذیب کی نفی کا تصور اکبر سے مستعار لیا اور یوں قطعاً غیر شعوری طور پر ایک بلند سطح پر آ کھڑا ہوئے۔ لیکن اقبال کے ہاں حالی اور اکبر کے میلانات سے

مطابقت کا رجحان اس ایک ''نقطے'' پر ختم ہو جاتا ہے مثلاً حالی قوم کو خارجی سطح پر خوش حال دیکھنے کے متمنی تھے اور اس کام کے لیے انھوں نے اہلِ وطن کو مغرب کی ترقی یافتہ قوموں کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے کی ترغیب دی تھی جب کہ اقبال مغربی تہذیب کو ایک بندی خانہ تصور کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ یہ ''تہذیب'' اپنے ہاتھوں آپ ہی خودکشی کر لے گی۔ غالباً مغربی تہذیب سے ایسی شدید نفرت کا باعث اقبال کا یہ احساس بھی تھا کہ وہاں فرد روحانی طور پر متحرک نہیں رہا اور مشین کا ایک پرزہ بننے لگا ہے۔ پھر حالی اور اکبر کے ہاں ایک بلند اخلاقی سطح سے عوام کو مخاطب کرنے کی روش عام تھی اور ان دونوں کا موقف یہ تھا کہ قوم کو تنزل اور زوال سے بہر صورت بچانا نہایت ضروری ہے۔ گویا ان کے ہاں فرد کی آزادی اور بہبود کا تصور قوم کی آزادی اور بہبود کے مقصد تلے دم توڑ چکا تھا۔ یہودیوں کے ابتدائی ادوار میں ان کے پیغمبر قوم کو مخاطب کرتے اور قوم کو بحیثیتِ مجموعی نجات پانے کی تلقین کرتے تھے۔ حالی اور اکبر کے زمانے میں اندازِ گفتگو بالکل ویسا تو نہیں تھا تاہم اس بات سے انکار مشکل ہے کہ یہاں بھی فرد کے مقابلے میں قوم اور جزو کے مقابلے میں کل کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ بے شک اقبال نے تخاطب کا انداز اور ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑے ہونے کی روش تو حالی اور اکبر سے مستعار لی لیکن انھوں نے پہلی بار معاشرے میں فرد اور کائنات میں انسان کو اس کا کھویا ہوا منصب واپس دلانے کی کوشش کی۔ انفرادیت کے اس رجحان ہی میں اقبال کی عظمت پنہاں ہے۔

اقبال کے ہاں فرد اور سوسائٹی کے رشتے کے کئی مدارج ہیں اور بعض نقادوں کو اس ضمن میں اقبال کے ہاں تضادات بھی نظر آئے ہیں۔ کسی شاعر کے ہاں فکری تضاد کی نمود کوئی عیب کی بات نہیں کیوں کہ شاعر تو اپنے تاثرات کو پیش کرتا ہے، کسی مربوط اور منظم فلسفے کا داعی بن کر ظاہر نہیں ہوتا۔ اقبال کے سلسلے میں المیہ یہ ہوا کہ یار لوگوں نے انھیں شاعر سے کہیں زیادہ ایک فلسفی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے معترضین کو کھل کر بات کرنے کی تحریک ملی ہے کیوں کہ اقبال کے ہاں بظاہر نہ صرف فکری تضاد ملتا ہے بلکہ ان کے کئی نظریات مختلف حکما کے نظریات سے متاثر بھی ہیں۔ لیکن اقبال کی عظمت فی الاصل ان کے جمالیاتی رویے کے باعث ہے اور اس رویے کے تحت فکری تضادات محض احساسی ارتقا کی مختلف کڑیوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں مثلاً اقبال کے ہاں فرد اور سوسائٹی کے رشتے کو لیجیے! آغازِ کار میں حب الوطنی کے جذبے کے تحت اقبال نے ہندوستان کی دھرتی سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا تھا۔ پھر جب وہ آگے بڑھے تو انھیں وطن کے مقابلے میں ملّت کا تصور زیادہ جاندار نظر آیا پہلی صورت میں فرد زمین کے ساتھ اس طور چمٹا ہوا تھا جیسے بچہ ماں کے ساتھ موخرالذکر کیفیت کے تحت سماج اور فرد کا رشتہ، مشین اور اس کے پرزے کا رشتہ تھا:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

لیکن جلد ہی اقبال کے ہاں ایک متوازن نظریہ ابھر آیا اور وہ فرد اور سماج کے رشتے کو:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے

سے ظاہر کرنے لگے احساسی ارتقا کی یہ سطح بے حد خیال انگیز ہے کہ اس تک پہنچنے کے بعد اقبال نے فرد اور سماج کو ہم پلّہ کر دیا ہے۔ اب فرد محض مشین کا ایک پرزہ نہیں اور نہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جسے سماجی قوانین اور بندشوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جکڑ دیا گیا ہو بلکہ اب

اس کے ہاں حریف کے تصور نے واضح طور پر جنم لے لیا ہے اور وہ پابہ گل ہونے کے باوجود آزاد بھی ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں اقبال اور نظم گو شعرا کی قطار سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں اور انفرادیت کے علم بردار بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ اردو نظم کو اس کے اصل مزاج سے قریب تر کرنے میں اقبال کے اس اقدام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بے شک اقبال نے فرد کو پوری طرح آزاد ہو جانے کی اجازت نہیں دی لیکن اسے جزوی طور پر آزاد کر کے مکمل آزادی کی طرف گامزن ضرور کیا ہے۔ آگے چل کر جدید اردو نظم میں انفرادیت کا جو بھرپور رجحان وجود میں آیا۔ وہ اقبال کے اس اقدام کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔

اقبال کے ہاں انفرادیت کی نمود کا دوسرا بڑا مظہر انسان اور کائنات کا وہ رشتہ ہے جس میں انھوں نے انسان کی عظمت کو اُجاگر کر کے قدیم مابعدالطبیعات سے اپنا قدم باہر نکالا ہے۔ فرد اور ملّت کی کشمکش کے بیان میں تو اقبال ایک حد تک اخفائے ذات کے عمل میں مبتلا تھے لیکن انسان اور کائنات کے رشتے کے بیان میں انھوں نے ان قدیم تصورات سے پوری طرح انحراف کیا جن کے تحت کائنات میں انسان بے بس، مجبور اور لاچار تھا اور اس کی ہستی ایک لازوال قوت کے مقابلے میں قطعاً بے معنی اور حقیر تھی۔ اقبال نے ''زوالِ آدم خاکی'' کے اس تصور کو قبول نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ وہ ایک بے نام جزو کی طرح کائنات کے ''کُل'' کے ساتھ چمٹے رہنے کو ناپسند کرتے تھے چناں چہ جہاں اقبال کی یہ روش قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے فرد کو سوسائٹی کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی وہاں ان کا یہ اقدام بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے کائنات میں انسان کو ایک اعلیٰ مقام دلانے کی سعی کی۔ اقبال کے نزدیک تحرک کا فقدان کوئی قابلِ فخر بات نہیں تھی۔ چناں چہ اقبال کی نظم آدم کو کائنات کے بارِگراں سے آزاد کرانے اور اس کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی ایک دل آویز کوشش ہے۔ اس کے تحت اقبال نے آدم کی عظمت کو مردِ مومن، شاہین اور عقاب ایسی علامات سے ظاہر کیا ہے اور اس میں قوت، ہمت اور ذہنی اور جسمانی تفوق کے جملہ عناصر کو یکجا دیکھنے کی آرزو کی ہے۔ خدا کے ساتھ اقبال کی مدِمقابل کی سی باتیں دراصل آدم کی نئی نویلی انفرادیت کے منظرِ عام پر آنے ہی کی باعث ہیں:

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

یہ اور اسی وضع کی دوسری مثالوں پر غور کریں تو جدید اردو نظم کے سلسلے میں اقبال کی عطا کا فی الفور اندازہ ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے اس تصور کی نفی کی جس کے تحت آدمی کو پیدائشی گناہ گار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کا موقف یہ تھا کہ آدم کی لغزش بھی اس کی عظمت کی دلیل ہے اور یہ آدم ہی تو ہے جس نے خاک کو افلاک کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس طور کہ فرشتوں کو بھی اس پر رشک آتا ہے۔ آدمی کو ایک شدید احساسِ کمتری سے نجات دلا کر اس میں خود اعتمادی اور خودشناسی کا جوہر پیدا کرنے کا یہ اقدام فرد کی

انفرادیت کو منظرِ عام پر لانے ہی کی ایک کاوش تھی۔ چوں کہ اقبال سے قبل اردو نظم نے عام طور سے فرد کی اس انفرادی حیثیت کو اجاگر نہیں کیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اقبال کی یہ روش ایک بالکل نیا اور تازہ اقدام تھا اور اس کے باعث افراد کے اذہان میں ہیجان اور ابھار وجود میں آیا جس نے آگے چل کر اردو نظم کو ایک بھرپور انداز میں ظاہر ہونے میں مدد دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال سے قبل آدم کے خاکی مسکن یعنی زمین کو بھی کثافت، زوال اور پستی کی آماج گاہ متصور کیا گیا تھا اور اس کے مقابلے میں آسمان کی عظمت، رفعت اور پاکیزگی کو عام طور سے سراہا گیا تھا۔ اقبال نے جب آدم کی عظمت کے گن گائے تو قدرتی طور پر انھوں نے آدم کے مسکن کو بھی بڑی اہمیت دی۔ قیاس غالب یہ ہے کہ خاک سے اقبال کی اس وابستگی میں حب الوطنی کے اس میلان کا بھی ہاتھ تھا جو اقبال کے ابتدائی کلام میں بہت نمایاں ہوا تھا۔ نظریاتی سطح پر تو اقبال نے اس میلان کو عبور کر لیا تاہم نفسیاتی سطح پر اس کا استحصال ناممکن تھا۔ چناں چہ اب انھوں نے وطن سے محبت کے جذبے کو خاک سے محبت کے جذبے میں مبتدل کر دیا تھا۔ نظم کی ترویج کے سلسلے میں خاک سے اقبال کا یہ لگاؤ بے حد اہم تھا کیوں کہ نظم خارجی اور ارضی اشیا اور مظاہر سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے بعد ہی اندر کی دنیا کی طرف بڑھتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اقبال نے خاک کے پتلے کو ایک جامد حالت میں دیکھنے کے بجائے اسے تغیر، حرکت اور حرارت کی علامت جانا اور اسے خودی کے حصول کے لیے ایک لمبا سفر اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ یہ سفر خارجی سطح پر ہی نہیں، داخلی سطح پر بھی اہم تھا اور جدید نظم کے مزاج کی تشکیل میں پوری طرح صرف ہوا۔ سفر کا تصور بجائے خود اس امر کا غماز ہے کہ فرد اب اپنے معاشرے کا محض ایک بے نام جزو نہیں بلکہ اب وہ رختِ سفر باندھ کر ایک طویل آوارہ خرامی کے لیے گھر سے باہر نکل آیا ہے، اقبال کا خیال کہ ''گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند'' اس سفر کی ہی نشان دہی کرتا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جب اقبال یورپ گئے تو انھیں وہاں ایک فکری پت جھڑ سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ پت جھڑ کی یہ رُت یورپی زندگی میں آنے والی ایک طویل بہار کے بعد اس طرح نمودار ہوئی تھی کہ یورپی انسان سے ایک صدیوں پرانی جملہ اخلاقی اور روحانی بنیادیں ہی چھن گئی تھیں اور وہ اب خود کو ہوا میں معلق محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف سائنس نے اس کی محدود و محفوظ کائنات کو ایک دھماکے سے اُڑا دیا تھا تو دوسری طرف ارتقا کے نظریات نے اسے حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ پھر یکا یک اس پر ایک عالمی جنگ نازل ہوئی اور یورپی انسان اپنے تہذیبی لبادے کو پھاڑ کر بالکل ننگا ہو گیا۔ یہ گویا اس بات کی توثیق تھی کہ انسان واقعتاً اپنے تہذیبی نقاب کے پیچھے محض ایک حیوان ہے جو جبلتوں کا مطیع ہے نہ کہ اخلاقی یا روحانی تقاضوں کا۔ چناں چہ مغرب کے بعض مفکرین نے زوالِ یورپ کے اس روپ کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بار بار اظہار کیا کہ یورپ روحانی اور اخلاقی طور پر بالکل بانجھ ہو چکا ہے۔ شپنگلر، ٹائن بی، سوروکن ان تینوں نے زوالِ مغرب ہی کو موضوع بنایا اسی طرح یورپی شعرا نے یورپ کو ایک ویرانے، یا ویسٹ لینڈ کے طور پر محسوس کیا اور ضرورت کا احساس عام طور سے ہونے لگا۔ کہ ایک روحانی تشکیلِ نو کے بغیر مغرب کا انسان اس ویسٹ لینڈ کی دم روکنے والی کیفیت سے باہر نہیں آ سکتا۔ اقبال جب یورپ گئے تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس ویسٹ لینڈ کے نقوش کو دیکھا اور محسوس کیا۔ لہٰذا یورپی تہذیب کے خلاف اقبال کا ردِعمل ویسا ہرگز نہیں تھا جیسا مثلاً اکبر اور اس کے معاصرین کا۔ یہ لوگ تو مغربی تہذیب کی اجنبیت سے نالاں تھے اور اگر اسے ہدف طنز بنانے پر مصر تھے — تو محض اس

لیے کہ ایسا کر کے وہ اپنی دیسی تہذیب کا تحفظ کر سکتے تھے مگر اقبال مغربی تہذیب کے اصل المیہ سے واقف تھے اور اسے ایک روحانی قحط سالی سے تعبیر کر رہے تھے چناں چہ انھوں نے اپنی نظم میں نہ صرف یورپی زندگی میں نمودار ہونے والے ویسٹ لینڈ کی نشان دہی کی، نہ صرف اس بات کا احساس دلایا کہ اس ویسٹ لینڈ کی — سرحدیں خود ہماری سرزمین کے اندر بھی پھیل رہی ہیں بلکہ اس کی یلغار کو روکنے کے لیے ایک روحانی نشاۃ الثانیہ کی ضرورت پر بھی زور دیا کہ یہی پانی کا وہ قطعہ تھا جو آگے بڑھتے ہوئے صحرا کا راستہ روک سکتا تھا بے شک جدید اردو نظم نے مغربی ادبیات سے براہِ راست بھی ویسٹ لینڈ کا تصور اخذ کیا مگر اس ویسٹ لینڈ کی پھیلتی ہوئی سرحدوں کا احساس اقبال کی نظم کی وساطت ہی سے اس تک پہنچا۔ اس کے علاوہ روحانی تربیت کے ذریعے عرفان اور آگہی کے مدارج طے کرنے کا میلان بھی اقبال کی نظم ہی کے ذریعے جدید نظم میں داخل ہوا۔ لہٰذا آج اگر ہمیں جدید اردو نظم میں ایک صوفیانہ رَو زیرِ سطح محسوس ہو رہی ہے جس کے باعث نظم نے موجود سے منقطع ہوئے بغیر اس کی حدود کو عبور کر کے کائنات کی بے کنار وسعتوں سے رشتہ قائم کیا ہے تو یہ فی الحقیقت اقبال کی نظم ہی کا فیضان ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اقبال نے یورپی زندگی کے مشاہدہ اور اس کے فکری مکاتب کے مطالعے سے ''پیکار'' کا تصور اخذ کیا تھا اور جب سے ایک وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھا تھا تو انھیں اس کی صورت ''دائیں'' اور ''بائیں'' کی آویزش میں نہیں بلکہ خیر اور شر کے تصادم میں نظر آئی تھی۔ علاوہ ازیں اقبال نے یورپی زندگی میں مشین کے بڑھتے ہوئے تسلط اور مشرق پر مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی یلغار کے پیشِ نظر فرد اور معاشرے کی آویزش کا بھی ادراک کیا تھا اور اسے ایک وسیع تناظر میں رکھ کر جزو اور کل کی ''پیکار'' کو بھی محسوس کر لیا تھا گویا انھوں نے بیسویں صدی کی فضا سے ''پیکار'' کی بو سونگھ لی تھی اور اب اس سے اوپر اٹھنے کے تمنائی تھے۔ چناں چہ اقبال کی نظم نے نہ صرف جدلیات کے مظاہر اور تصورات کو اپنے اندر جذب کیا بلکہ تصادم اور آویزش کے اندر سے خیر کی یکتائی کے تصور کو بھی ابھارا۔ اقبال کا خیال کہ جبر اور اختیار متضاد نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں اور انسان بیک وقت آزاد بھی ہے اور پابہ گل بھی ایک ایسا نظریہ تھا جو پیکار اور آویزش کا منہ چڑا رہا تھا۔ ہر چند جدید اردو نظم نے ویسٹ لینڈ کے تصور کی طرح پیکار کے مظاہر کو براہِ راست بھی محبوس کیا اور ترقی پسند نظم تو بالخصوص مادی سطح کی پیکار سے بری طرح متاثر ہوئی تاہم اقبال کے معتدل اور متوازن رویے نے یہاں بھی جدید اردو نظم پر اپنے اثرات کچھ یوں مرتسم کیے کہ نظم لکھنے والوں نے مادی جدلیات کو عبور کر کے کائناتی جدلیات کا ادراک کر لیا اور پھر پیکار کی سطح سے ''اکائی'' کی سطح پر اُٹھ آئے یہ ایک خاص مشرقی اندازِ فکر تھا جو اقبال کی وساطت سے جدید اردو نظم کی بنت میں شامل ہوا اور اسے ایک خاص لہجہ تفویض کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔

(جدید نظم نمبر ''اوراق''، ۱۹۷۷ء)

روسی کہانی

فائدہ

مائخیل زوشنکوف
ترجمہ: م۔ا۔خ

پلیگایا ایک جاہل عورت تھی۔

اس کا جاہل ہونا اس کے شوہر کے لیے سوہانِ روح تھا۔ وہ اس قدر جاہل تھی کہ دستخط بھی نہیں کر سکتی تھی!

ایک روز موقع پا کر اس کے شوہر نکولاوچ نے اس سے کہا:

''کم از کم اتنا علم تو حاصل کر لو کہ اپنا نام لکھ سکو۔ پھر تمھارا نام ویسے بھی آسان ہے۔''

''مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟'' پلیگایا نے استفسار کیا۔ ''میری انگلیاں بھی صحیح طریقے سے نہیں مڑتی ہیں۔ میں کیسے لکھ سکوں گی۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے بچوں کو پڑھاؤ اور میرا پیچھا چھوڑو۔''

نکولاوچ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس پلیگایا سے مغزماری کا وقت نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے ایک کتاب لے آیا۔ یہ زبان سیکھنے کی ابتدائی کتاب تھی اور جدید طریقوں سے ترتیب دی گئی تھی تاکہ پڑھنے والا آسانی سے زبان سیکھ سکے۔ پلیگایا نے اس کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک طرف رکھ دی یہ سوچ کر کہ یہ کتاب اس کے بچوں کے کام آئے گی۔ اس کے بعد وہ نکولاوچ کا کوٹ رفو کرنے بیٹھ گئی اسے محسوس ہوا کہ کوٹ کے اندر کوئی کراری سی چیز ہے۔ وہ سمجھی کہ شاید نوٹ ہوں گے لیکن جب اس نے اندر ہاتھ ڈالا تو دیکھا کہ اس میں ایک خط ہے۔ اس نے خط جیب سے نکال لیا۔ وہ خط خوشبو میں بسا ہوا تھا اور الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے تحریر کیے گئے تھے۔

پلیگایا کا دل ٹوٹ گیا۔

اس نے سوچا۔

''اچھا اب میں سمجھی یہ مجھ میں تو دلچسپی لیتے نہیں لیکن کسی اور جگہ عشق لڑاتے ہیں۔ تو کیا انھوں نے مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے؟ مگر ٹھیک ہی تو ہے۔ میں جاہل جو ہوں۔''

وہ کافی دیر تک اپنی سوچوں میں غلطاں رہی۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ ''میں پڑھوں گی اور جب میں تعلیم یافتہ ہو جاؤں گی تو نکولا وچ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکے گا۔

اس دن کے بعد سے اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

ایک مہینہ گزرا۔

دوسرا مہینہ گزرا۔

اور پھر تیسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ اب وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو آسانی سے پڑھ سکے۔

اِدھر نکولا وچ خوش تھا کہ پلیگایا علم کی طرف راغب ہو چکی ہے۔

ایک دن جب نکولا وچ کام پر گیا ہوا تھا تو پلیگا کو یاد آیا کہ خوشبو میں بسا ہوا وہ خط اس کے صندوق میں محفوظ ہے۔ اس نے سوچا کہ اسے اس خط کو پڑھنا چاہیے تا کہ اسے یہ علم ہو سکے کہ نکولا وچ کس عورت سے عشق لڑا رہا ہے۔

اس نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔

خط میں لکھا تھا۔

''پیارے نکولا وچ۔

حسب وعدہ کتاب روانہ کر رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ دو تین ماہ میں تمھاری پیاری بیوی اس کتاب کے مطالعے کے بعد جہالت کے خول سے باہر نکل آئے گی۔ نکولا وچ! اسے سمجھاؤ کہ جاہل ہونا کس قدر بری بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ تعلیم یافتہ عورت کہلانے میں فخر محسوس کرے گی۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگ جہالت کے خاتمے کی تحریک لے کر اٹھے ہیں جس میں ہمیں روز بروز کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم علم پھیلانے کا کام اپنے گھروں سے شروع کریں۔ بس تم پلیگایا کو پڑھاؤ۔

نیک تمناؤں کے ساتھ۔

ماریا بلوخینا...

خط پڑھ کر پلیگایا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

(ماہنامہ ''طلوع افکار''، کراچی، دسمبر جنوری ۱۹۸۹ء)

نیاز فتح پوری شخصیت اور فن

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

اس کتاب میں علامہ نیاز فتح پوری کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کا تخلیقی اور تنقیدی جائزہ احسن طریقہ سے ڈاکٹر عقیلہ شاہین نے پیش کیا ہے۔ ادبی حلقوں کے لیے گراں قدر سرمایہ ہے۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو شعرا کے تذکروں کے حوالے سے یہ بڑا وقیع کام ہے۔ اس کتاب میں ۶۸ تذکروں اور تذکرہ نگاروں کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ ساتھ اور تذکرہ نگاروں کے ارتقا اور اس کی تاریخی و ادبی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

علی احمد فاطمی

ہمارے قاضی عبدالستار صاحب

بزرگوں پر مضمون لکھنا وہ بھی شخصی اور تاثراتی نوعیت کا، مشکل کام ہوتا ہے۔ ویسے بزرگوں کی بھی کتنی قسم ہوتی ہے۔ کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جو بزرگ ہوتے ہوئے بھی دوست ہوتے ہیں جیسے میرے لیے قمر رئیس صاحب، اقبال مجید، عابد سہیل، محمود الحسن وغیرہ۔ کچھ بزرگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عزت و احترام، بے تکلف قسم کا مضمون لکھنے میں حائل ہوتے ہیں۔ جیسے رشید حسن خاں، محمد حسن، ڈاکٹر سید محمد عقیل وغیرہ، حالاں کہ میں نے فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری جیسے بزرگوں اور شہرت یافتہ شاعروں پر تاثراتی مضامین لکھے ہیں۔ لیکن یہ لوگ فن کار تھے اور ایسے بڑے فن کار اور دانشور جن کا تعلق ہر نسل سے ہوتا ہے۔ کچھ شخصیتیں ان کے درمیان آتی ہیں جن کی شخصیت کے پیچ وخم اور کیف وکم ازخود متاثر اور مائل کرتے ہیں۔

قاضی عبدالستار کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ایک بزرگ، ایک استاد اور رائٹر کی حیثیت سے قاضی صاحب کا بھی میں بے حد احترام کرتا ہوں۔ لیکن ان سب سے قطع نظر ان کی شخصیت میں ایک سرور آمیز کھراپن اور آمیز نوکیلا پن ہے۔ ایک عجیب طرح کا بانکپن بلکہ مزیدار قسم کا کڑواپن جس میں ایک نیاپن اور اپنا پن تو ہوتا ہی ہے کبھی کبھی اور کئی قسم کے ''پن'' جھلک پڑتے جو بڑا مزہ دیتے اور یہی وہ مزہ ہے جس نے یہ مضمون لکھنے پر مجبور کر دیا۔

آپ قاضی صاحب سے اگر ذرا بھی قریب ہیں تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ صبح سے لے کر شام تک، چائے سے لے کر جام تک، نام سے لے کر کام تک یہاں تک کہ آل احمد سرور سے لے کر خورشید الاسلام تک۔ غرض کہ ہر عمل، ہر گفتگو میں ایک مخصوص ترنگ ہوتی۔ طنطنہ ہوتا۔ گرج چمک بھی اور پھر نرمی اور لچک بھی۔ لیکن یہ نرمی اور یہ بیش بہا موتی ہر اک کے حصے میں کم آتے ہیں۔ ایک بار اعتماد کا گوہر ہاتھ لگ جائے تو سب کچھ لوٹ لیجیے۔ دامن بھر لیجیے۔ کم از کم جب تک آپ ان کی صحبت میں رہیں گے تو یہی محسوس ہوگا کہ آپ کی سماعت اور ذہانت آپ کا من اور دامن سب موتیوں سے بھر گئے ہیں، بلکہ چھلک پڑے ہیں، بعد کا حساب میں نے کبھی نہیں کیا اور اکثر نے نہیں کیا۔ اس لیے کہ کچھ تو وقت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

سچ تو یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت پر مجھے لکھنے کا وہ حق نہیں ہے جو ان کے قریب کے شاگردوں اور بے تکلف دوستوں کا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں نے کبھی ان کو اپنے استاد سے کم نہیں سمجھا۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے استاد (سید محمد عقیل) کے دوست ہیں

دوسری وجہ یہ کہ میرے دوستوں (اشرف، غضنفر، طارق، کنول وغیرہ) کے استاد ہیں۔ دونوں حوالوں سے مجھے ان کو استاد کی طرح ماننا ہی تھا، ورنہ وہ قاضی عبدالستار جو ایک افسانہ نگار ہے میں اس سے کافی پہلے واقف ہو چکا تھا۔ میں اس وقت ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ گھر میں علمی اور مذہبی ماحول تھا۔ والدہ، خالہ، بڑی بہنیں، شرر، راشد الخیری، صادق سردھنوی وغیرہ کے تاریخی ناول ذوق وشوق سے پڑھتی تھیں۔ ان ناولوں کے نام بھی عجب ہوتے تھے۔ ''فاتح مفتوح''، ''فاتح مکہ''، ''ملک العزیز ورجنا''، ''لرزتے آنسو''، ''شام زندگی'' وغیرہ کہ جن کے عنوان سے ہی آنسو ٹپکنے لگتے (کیا معلوم تھا کہ بعد میں ایسے ہی ناولوں پر تحقیق کرنی پڑے) مجھے تو ابن صفی کے ناول پسند آتے تھے کہ ان کے قصے، ان کے کردار، ان کی زبان مجھے ان دنوں دیوانہ کیے ہوئے تھے۔ میں یہ ناول چوری چھپے پڑھتا کہ گھر کا مذہبی ماحول کھلے عام پڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ والد صاحب گھر میں تاریخ طبری پڑھتے اور باہر میلاد شریف اور مجھے بھی ٹوپی پہنا کر نعت پڑھواتے۔ والدہ اور بڑی بہنیں دن میں لہک لہک کر سبز گنبد پر سلام بھیجتیں اور رات کو پوری عقیدت کے ساتھ اجتماعی طور پر شرر کے ناول پڑھے جاتے۔ عین انھیں دنوں سوتے جاگتے، دوڑتے، بھاگتے، اکبری اصغری، موہنا، انجلینا جیسے کرداروں کے نام میرے کان میں بھی پڑے جو بعد میں بہت کام آئے۔ پھر پتہ نہیں کب اور کیسے انھیں کتابوں کی بھیڑ میں ''پیتل کا گھنٹہ'' نام کی کتاب ہاتھ لگ گئی۔ کچھ اِدھر اُدھر سے افسانے ضرور پڑھ رکھے تھے لیکن ''پیتل کا گھنٹہ'' پڑھا تو دل ودماغ میں گھنٹی بج گئی۔ حالاں کہ اس وقت کچھ باتیں سمجھ میں نہ آئی تھیں کہ ایکّے والا گھوڑے کو چابک کیوں مارتا ہے اور پیتل کا گھنٹہ فروخت کیوں ہو جاتا ہے بس مجھے اپنے دیہات کے بڑے ابا یاد آئے اور شاندار مسجد جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو رہی ہے وہ یاد آئی۔ پکی سڑک سے گاؤں تک چلنے والے ایکّے بھی یاد آئے۔ اس کتاب کے سرورق پر گول پیتل کے گھنٹے کی اور بیک کور پر قاضی عبدالستار کی تصویر کو دیکھ کر ایک عجب سا ارتعاش پیدا ہوا تھا، کہہ پانا مشکل ہے کہ گھنٹی گھنٹے کی وجہ سے بجی تھی یا قاضی صاحب کی تصویر، تحریر اور تخلیق کی وجہ سے۔ یہ کتاب الٰہ آباد سے چھپی تھی کہ ان دنوں قاضی عبدالستار کے دوست بلونت سنگھ، محمود احمد ہنر، ضیا الاسلام وغیرہ نے الٰہ آباد سے رسالہ نکالنے اور کتابیں شائع کرنے کا نقصان دہ کام چھیڑ رکھا تھا ان تینوں کو فائدے کا کام آتا ہی نہ تھا۔ نقصان برداشت کرتے کرتے اور منھ سے خون تھوکتے ہوئے پہلے دو تو دنیا سے رخصت ہو گئے، ضیا الاسلام صاحب ابھی زندہ ہیں اور خدا کرے زندہ رہیں۔ اسی طرح چوری چھپے، کرشن چندر، عصمت چغتائی، رام لعل وغیرہ کے افسانے ابن صفی کے دل آویز ناول پڑھتا اور دن دہاڑے محفل میلاد میں رقت آمیز ترنم سے نعت خوانی کرتا اسی طرح دو چار سال اور گزرے تو ایسے جلسوں کی نظامت بھی کرنے لگا۔ ایک بار ایسی ہی ایک محفل میں علی گڑھ سے محترم نسیم قریشی مہمان مقرر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ میں اس وقت تک احتشام حسین کا شاگرد ہو چکا تھا اور ایم اے کرنے کے بعد شرر کے تاریخی ناولوں پر ریسرچ کرنے کے بارے میں سوچ کیا رہا تھا بلکہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا، اس لیے کہ مجھے مشاعرے وغیرہ کی نظامت میں زیادہ مزہ آتا تھا خواہ وہ نعتیہ شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی مذکورہ مشاعرہ کی نظامت میں کچھ اس انداز سے کر گیا کہ نسیم قریشی کے پان کی سرخی کچھ اور زیادہ سرخ ہو گئی۔ تعارف ہوا اور جب میں نے شرر کا نام لیا تو اچانک پان کی پیک ٹپک پڑی اور وہ اپنے پان کی چھینٹوں سے تر رومال سے پوچھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے بھی کبھی شرر پر پی ایچ ڈی کا کام شروع کیا تھا لیکن کر نہ سکا، تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو میرے پاس

کچھ مواد ہے وہ سب میں تمھیں دے دوں گا۔'' اور اس طرح مواد کی لالچ میں کم علی گڑھ یونی ورسٹی دیکھنے اور گھومنے کی لالچ میں میں ان کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ میں نے علی گڑھ میں نسیم صاحب کے ساتھ آفتاب منزل، شمشاد مارکیٹ میں قیام کیا۔ پہلی مرتبہ تقریباً پندرہ روز اور دوسری مرتبہ ماہ ڈیڑھ ماہ۔ وہیں میری ملاقاتیں انگریزی کے سید امین اشرف اور اردو کے ابوالکلام قاسمی سے ہوئیں۔ علی گڑھ میں نسیم قریشی کی زندگی، ان کے نوکر چاکر، ان کا رہن سہن، ان کا پاندان، ان کی شیروانی، ان کی محفل آرائی۔ ان کے احباب اور پورے علی گڑھ میں ان کی حیثیت اور قدر و قیمت، یہ الگ الگ باب ہیں۔ اس پر پھر کبھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ علی گڑھ میں اکثر شخصیتوں کے الگ الگ باب ہیں اور کبھی کبھی تو یہ باب پڑھے بھی نہیں جا پاتے بقول شاعر:

میری حیات کا افسانہ دیکھنے والو
کہیں کہیں سے یہ قصہ پڑھا نہیں جاتا

اسی زمانے میں میری ملاقات ایک ذہین طالب علم شارق ادیب سے ہوئی جسے ابتداً پڑھنے لکھنے کا اور ادیبوں سے ملنے ملانے کا اور دوست بنانے کا شوق تھا، چناں چہ جلد ہی ہم دونوں دوست بن گئے اور میں نے اس سے قاضی عبدالستار صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شارق نے شعبۂ اردو کے بجائے گھر پر ملاقات کی تجویز رکھی۔

ان دنوں قاضی صاحب دودھ پور کے ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کے ایک حصے میں وہ خود تھے اور دوسرے حصے میں وحید اختر مرحوم۔ شام کو چپکے چپکے شارق مجھے قاضی صاحب والے حصے کی طرف لے گیا، کچھ اس طرح کہ دوسرے حصے کو خبر نہ ہو۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا، اس وقت تو ایسا لگا تھا جیسے ہم اپنے محبوب کے گھر میں اس کے والد کے ڈر سے چوری چھپے داخل ہو رہے ہیں۔ اب یاد تو نہیں کہ اس پہلی ملاقات میں کیا کیا باتیں ہوئیں، اور ہو بھی کیا سکتی تھیں میں ایک ادنیٰ طالب علم تھا (آج بھی ہوں) البتہ اس پہلی ملاقات میں قاضی صاحب مجھے محبوب ہی لگے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ میں شرر کے تاریخی ناولوں پر ریسرچ کر رہا ہوں تو انھوں نے اپنے تاریخی ناول ''دارشکوہ''، ''صلاح الدین ایوبی'' پڑھنے کو کہا تھا اور شارق نے ہی یہ ناول پڑھنے کو دیے اور یہ ناول میں نے انھیں دنوں علی گڑھ میں ہی پڑھ ڈالے تھے اور پھر جب علی گڑھ سے قربت ہوتی گئی تو اندازہ ہوا کہ علی گڑھ اپنے آپ میں ایک ریاست ہے جس میں نہ جانے کتنے داراشکوہ اور صلاح الدین ہیں۔ بہرحال جو کوئی بھی تھا اور جو کچھ بھی تھا اپنے آپ کو بادشاہ وقت سے کم نہ سمجھتا تھا۔ یہ بات اس وقت زیادہ محسوس ہوئی جب شعبۂ اردو میں ایک پروفیسر شپ تھی اور دو بڑے امیدوار تھے۔ قاضی عبدالستار اور خلیل الرحمٰن اعظمی۔ خورشید الاسلام صدر شعبہ تھے، ان کا طوطی بولتا ہی تھا کچھ ان کے طوطے بھی بولتے تھے، رٹے رٹائے جملے۔ خیر میں تو باہر کا تھا مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مجھے جو بات اچھی لگی تھی وہ یہ کہ پڑھنے لکھنے والے نوجوان کی بھیڑ تھی۔ شارق کے ذریعے میری ملاقاتیں سید امین، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، ابن کنول، غیاث الرحمٰن وغیرہ سے ہوئیں اور ابوالکلام قاسمی کے ذریعے آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، عبید صدیقی، مہتاب حیدر نقوی، اسعد بدایونی، غضنفر وغیرہ سے۔ پھر یہ دائرہ پھیلتا ہوا منظور ہاشمی، عبیدالرحمٰن ہاشمی، پیغام آفاقی، نوری صاحب، پروفیسر جعفری، طارق سعید وغیرہ تک پہنچا بزرگوں میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شہریار،

اطہر پرویز، نورالحسن نقوی، زیدی جعفر رضا۔ اور بزرگوں میں آل احمد سرور، معین احسن جذبی اور اسلوب احمد انصاری تک میں جا پہنچا۔ شارق نے ہی دو ایک بار رشید احمد صدیقی سے بھی ملاقات کروائی۔ لیکن اس پوری بھیڑ میں قاضی صاحب کی بات اور شناخت بالکل الگ تھی۔ اس میں ان کے طور طریقے اور رکھ رکھاؤ کا دخل تو تھا ہی شاگرد نوازی اور خورد نوازی کا بھی تھا یا شاید اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ ان کے قریب تھے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اشرف، شارق، طارق، کنول، غیاث وغیرہ شروع ہی سے افسانہ نویسی کی طرف متوجہ تھے اور ان کا فطری وفکری جھکاؤ ایک بڑے افسانہ نگار کی طرف تھا۔ غضنفر اس وقت شہریار کی معیت میں شاعری کی طرف زیادہ متوجہ تھے، افسانہ کی طرف بعد میں غالباً سولن میں ملازمت مل جانے کے بعد آئے۔ پیغام آفاقی کو کم از کم علی گڑھ تک اکا دکا معمولی کہانی کے ذریعے ہی جان سکا تھا۔ شارق اور طارق کے ساتھ میری نہ جانے کتنی ملاقاتیں قاضی صاحب سے ہوئیں۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا دائرہ پھیلتا گیا۔ الہٰ آباد، پٹنہ، دہلی اور نہ جانے کہاں کہاں۔ ان ملاقاتوں کا نہ کوئی حساب اور نہ کوئی فہرست۔ یہ مجھے ضرور یاد ہے کہ قاضی صاحب نے ہی سب سے پہلے تاریخی ناول کے فن اور اصول کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرمایا تھا کہ جب تک تمھارا ذہن صاف نہ ہوگا جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ تاریخ کیا ہوتی ہے اور ناول کیا ہوتا ہے پھر یہ کہ تاریخی ناول میں دونوں کی آمیزش ایک بے حد مشکل امر ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ناول کی تمام قسموں میں سب سے مشکل قسم تاریخی ناول کی ہی ہوتی ہے۔

''کیوں؟'' میں نے طالب علمانہ سوال کیا تھا۔

''اس لیے کہ اس میں تاریخ اور تخیل کا امتزاج ہوتا ہے اور یہ دونوں باہم بعد اور تضاد رکھتے ہیں۔ تاریخ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اور ناول، ناول کا قصہ، کردار، زبان وغیرہ کا تعلق حقیقت سے ہوتے ہوئے بھی تخیل وتصور سے ہوتا ہے۔ اپنی ایک دنیا آباد کرنی ہوتی ہے اور آپ کو حقیقتوں سے باہر نہیں جانے دیتی، وہاں تصور کے پر جلنے لگتے ہیں۔''

قاضی صاحب یہ باتیں ایک مخصوص اور پرشکوہ انداز میں کہتے، کہ وہ خود ایک تاریخ یا تاریخی کردار لگنے لگتے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ان کا تخت اور گاؤ تکیہ اس پورے عمل میں کلیدی کردار ادا کرتے۔ کبھی تکیہ ان کی گود میں ہوتا اور کبھی وہ تکیہ کی گود میں۔ سچ بات یہ ہے کہ گھر کی آرام دہ زندگی میں گاؤ تکیہ ان کی شخصیت سے اس قدر گھل مل گیا تھا کہ انھوں نے تکیہ کے علاوہ کسی اور پر تکیہ کیا ہی نہیں۔ جب تکیہ پر ان کی کہنی ٹکی ہوتی تو سمجھ لیجیے کہ وہ کوئی تاریخ دہرانے جا رہے ہیں اور تاریخ میں سچائی تو ہوتی ہی ہے اور سچائی میں کڑواہٹ جو دراصل صداقت کی ہوتی جسے قاضی صاحب سے منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن قاضی صاحب اس انتساب سے خوش ہی ہوتے۔ حالاں کہ اس خوشی میں کچھ ان کی خارجی اور نفسیاتی وجہیں بھی کام کرتی رہتیں جن کی تفصیل میں جانا مناسب ہے نہ سود مند، بس کچھ اشارے ہی کافی ہوں گے۔

جن دنوں وہ سلیمان ہال کے سامنے رہتے تھے۔ میں اپنے ایک دوست فخر الکریم کی تھیسس کی رپورٹ کے سلسلے میں ان کے پاس گیا۔ انھیں کچھ یاد نہ تھا، موضوع دریافت کیا تو میں نے عرض کیا ''اردو ناول میں خاندانی زندگی'' پہلے تو مقالہ تلاش کرنے کوشش کی گئی جب وہ نہیں ملا تو فرمایا شام کو رپورٹ لے لیجیے گا، آپ کا کام تو ہو چکا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک خاص تیور میں بولے۔

''تاریخی ناول کو آپ کتنا سمجھ سکے؟''

میں نے اپنے طور پر کچھ باتیں کیں۔ تیور تیوری میں بدل گئے۔ فرمایا۔

''دیکھیے برخوردار تاریخی ناول پر کام کرنا آسان نہیں۔ کتنے انگریزی کے ناول پڑھے آپ نے...؟ یہ اردو والے تاریخ وارخ کیا جانیں، انھیں عشق ومحبت سے ہی فرصت نہیں۔ جب دیکھیے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ بس مزاج اور موسم ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ذرا ان شاعروں سے پوچھتے کہ ''فسانۂ عجائب'' پڑھی آپ نے، ''آئین اکبری'' کا مطالعہ کیا، ابوالکلام آزاد کی نثر سمجھی آپ نے۔ اگر یہ کہہ دیں کہ سمجھ لی، تو میں استعفیٰ دے دوں۔ خون تھوکنا پڑتا ہے نثر لکھنے میں....''

پھر وہ کچھ اور بولے اور بولتے ہی گئے میرا دھیان دوست کی تھیسس کی طرف لگا ہوا تھا۔ جب وہ چائے لینے اندر گئے تو میری نظر تخت کے نیچے پڑی جہاں وہ مقالہ پڑا ہوا تھا، جلدی سے میں نے نکالا اور ان کی خدمت میں پیش کیا۔

اس سے پہلے بھی قاضی صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی اور انھیں کی ہدایت پر ہی میں نے تاریخ اور تاریخی ناول سے متعلق انگریزی میں لوکاچ اور بٹرفیلڈ کی کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے مقالے میں پورا ایک باب تاریخی ناول کے فن سے متعلق منسوب کر دیا تھا جسے بعد میں میں نے الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا اور جب میں نے یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی تو انھوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور پیار سے اپنے قریب بٹھایا اور اپنا تازہ ترین تاریخی ناول ''غالب کا ایک نسخہ'' عنایت کیا اور پھر یوں گویا ہوئے:

''فاطمی۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ اردو یا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی زیادہ تر تاریخی ناول ایک خاص عہد ہی میں لکھے گئے۔ غدر کے بعد انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں، بیسویں صدی کی بعد کی دہائیوں میں کوئی ایک بھی تاریخی ناول دکھا دیجیے۔ سوائے قاضی عبدالستار کے...''

میں نے عرض کیا۔ ''شرر کے مقلدین صادق سردھنوی، ایم اسلم وغیرہ بیسویں صدی کے ہی ہیں۔''

''یہ تاریخی ناول نگار نہیں بلکہ یہ تو ناول نگار ہی نہیں، یہ سب کمرشیل رائٹر ہیں۔ یہ ناول کم لکھتے ہیں قوم کو افیم زیادہ کھلاتے ہیں۔ ان کے یہاں تاریخ ہے نہ ناول۔ اور کون ہے بتایئے...''

میرے ذہن میں عصمت چغتائی کا ناول ''ایک قطرۂ خون'' کا نام آیا۔ ''آگ کا دریا'' کو بھی ہم نیم تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں، لیکن میں نے مارے احتیاط کے ان کے نام نہیں لیے کہ یہ خواتین ہیں اور پتہ نہیں جھونک میں قاضی صاحب کس طرح نواز دیں۔ حالاں کہ مجھے معلوم ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں احترام کا بھی جذبہ ہے اور دونوں بڑی خواتین کا نام احترام سے لیتے رہے ہیں۔ آپ قاضی صاحب کی گفتگو چاہے جس انداز سے لیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ''داراشکوہ'' اور ''صلاح الدین ایوبی'' طرز کے ناول اس عہد میں نہیں لکھے گئے۔ یہاں ایک بات پر میں اور چونکا تھا کہ تاریخی ناول نویسی کے عمل میں عام طور پر تاریخی ناول نگار ماضی بعید کے واقعات زیادہ لیتا ہے تاکہ حقائق جتنے مبہم ہوں گے اتنا ہی تصور وتخیل کو کام کرنے کا موقع زیادہ ملے گا۔ اردو میں ایسے ہی ناول زیادہ کامیاب ہوئے ہیں مثلاً ''فردوس بریں''، ''ایام عرب''، ''زوال بغداد'' بعض دوسرے۔ لیکن قاضی صاحب کے ساتھ معاملہ

برعکس ہے، جو شہرت ''داراشکوہ'' کو ملی وہ ''صلاح الدین ایوبی'' کے حصے میں نہیں آئی۔ حالاں کہ زبان و بیان کے معاملے میں جتنی محنت انھوں نے ''صلاح الدین ایوبی'' میں کی ہے جو تاریخی ماحول ابھارے وہ ''داراشکوہ'' میں نہیں ہے۔ میں نے اس مسئلے پر قاضی صاحب سے کبھی بات نہیں کی اس لیے کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ پھر مجھے علی سردار کے وہ جملے یاد آ گئے کہ ادب اور تخلیق کے معاملات عجیب و غریب ہوتے ہیں یہاں کوئی بندھا ٹکا اصول یا پیمانہ کام نہیں کرتا، اکثر عمدہ ادب ناہموار ماحول میں پھلتا پھولتا ہے۔ اس کی مثال وہ اس طرح دیتے کہ دیکھو دکن میں کس قدر شیعی ماحول اور تہذیب تھی لیکن انیس لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کم و بیش یہ عجیب و غریب باتیں قاضی صاحب کی شخصیت اور لٹریچر میں ہیں۔ قاضی صاحب کے ساتھ کچھ عجیب سے بنے بنائے راستوں پر چلنا انھیں پسند نہیں تھا وہ اپنا راستہ خود بنانے کے قائل ہیں اور کہیں بھی اس راہ میں رکاوٹ آ جائے تو قلم سے لے کر تلوار تک آ جاتے۔ فرد سے لے کر پریوار تک اور جنس سے لے کر کردار تک سب کی خیریت دریافت کر لیتے۔ میں اکثر اس تیکھے پن جو کبھی کبھی کڑوے پن میں بدل جاتا غور کرتا۔ ڈاکٹر غیاث الدین نے قاضی صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''قاضی عبدالستار دوست اور دشمن کا اشتہار اعلیٰ الاعلان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رعایت کا خانہ خالی نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں نے انھیں اکھڑ، ضدی اور بددماغ کا نام دے رکھا اور قاضی صاحب کو یہ نام بہت پسند ہیں۔''

(مقدمہ آئینۂ ایام، ص ۸)

ماہر نفسیات فرائڈ نے لکھا ہے کہ بچپن کی فطری مسرتوں سے محرومی یا حصول مسرت میں بے جا قسم کی رکاوٹیں آگے چل کر طبیعت میں ضد اور انانیت پیدا کر دیتی ہیں۔

مجھے قاضی صاحب کے بچپن کے واقعات کا زیادہ علم نہیں البتہ ان کی ہی زبان سیتاپور کے مچھر ہٹہ گاؤں کا ذکر سیکڑوں بار سنا جہاں وہ ۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ کہیں میں نے یہ بھی سنا یا پڑھا کہ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے ماموں قاضی جمیل الدین ایڈوکیٹ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ والدین کے بارے میں زیادہ علم تو نہیں لیکن ماموں کے ذریعے تعلیم و تربیت کا تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ والدین کی محبت و صحبت سے محرومی، ہر چند کہ زمین دار گھرانے کی شان بان کے ماحول میں وہ پلے بڑھے اور سارے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرتے گئے۔ لکھنؤ کے خالص ادبی و تہذیبی ماحول میں وہ بڑے ہوئے اور اعلیٰ تعلیم احتشام حسین اور محمد حسین جیسے بڑے نقادوں کے سائے میں ہوئی۔ ۵۶ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں لکچرر ہو گئے اور پھر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں قنوطیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سیتاپور، لکھنؤ کے شعری و ادبی ماحول میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، پھر پتہ نہیں کب اور کن حالات میں وہ کہانی کی طرف آ گئے اور ان کی پہلی کہانی ''اندھا'' کے عنوان سے لکھنؤ کے رسالہ ''جواب'' میں ۴۶ء میں شائع ہوئی، لیکن ان کو اصل شہرت اس وقت ملی جب ۱۹۵۴ء میں ان کا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' ادارۂ فروغ اردو کی طرف سے شائع ہوا جسے بعد میں ہندی والوں نے ''پہلا اور آخری خط'' کے نام سے چھاپا پھر اردو میں بھی اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا ناول ''شب گزیدہ'' ۱۹۵۹ء میں ''نقوش'' میں چھپا۔ ان کی غیر معمولی شہرت یافتہ کہانی ''پیتل کا گھنٹہ'' ۱۹۶۲ء میں رسالہ ''کتاب''

میں شائع ہوئی۔ ان دنوں قاضی صاحب شہرت کے آسمان پر تھے اور ان کی تخلیقات دھڑا دھڑ شائع ہو رہی تھیں۔ بادل، مجو بھیا، غبار شب کے علاوہ داراشکوہ، صلاح الدین ایوبی، غالب، خالد بن ولید، حضرت جان وغیرہ۔

اس مختصر سے تعارف سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سا واقعہ، حادثہ یا موڑ تھا جس نے قاضی صاحب کو ایسی ملازمت عزت اور شہرت کے باوجود ان کی زندگی اور ان کی شخصیت کو کسی من چاہی آسودگی سے محروم رکھا۔ البتہ کبھی کبھی یہ ضرور ہوتا ہے کہ شفقت و محبت کی کمی یا جنسی عدم تشفی اندر ہی اندر ایک خاص قسم کی کجی پیدا کر دیتی ہے کبھی کبھی سماجی اور خارجی عناصر بھی عجیب و غریب انداز سے کام کر جاتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اودھ کی ایک خاص تہذیب و تعلیم میں ڈھلا ہوا شخص دوسروں کی بدتہذیبی اور جہالت کو پل بھر کے لیے برداشت نہیں کر پاتا۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ وہ شاعری سے نثر نگاری کی طرف کیوں اور کیسے آ گئے۔ ان کی تحقیق کا موضوع بھی یاسیت اور قنوطیت سے پر تھا۔ کچھ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی گڑھ نے ان کی زمین دارانہ و معیار پرستانہ اقدار کی قدر نہ کی ہو، کہ ایک سے ایک جاگیردار وہاں پہلے ہی سے براجمان تھے اور علی گڑھ خود ایک رجواڑہ بن چکا تھا۔ علی گڑھ کی سیاست اور منافقت بھی دور دور تک شہرت رکھتی ہے۔ سرور صاحب کی سیاست کو قاضی صاحب سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے ریٹائر ہو جانے کے بعد جو جگہ خالی ہوئی اس کے دعوے دار ہوئے، مقابلہ خلیل الرحمٰن اعظمی سے تھا ان کی بھی ایک حیثیت تھی اور وہ ان دنوں بیمار بھی تھے۔ اس لیے تھوڑی سی ہمدردی بھی تھی، لیکن جب نتیجہ آیا تو قاضی پروفیسر ہوئے نہ خلیل صاحب، ایک تیسرے صاحب ہو گئے جن کی حیثیت ان دونوں کے مقابلے بہت کم تھی۔ ایک خیال ہے کہ اس حادثے نے تو خلیل صاحب کی جان ہی لے لی۔ قاضی صاحب کی تلخی، برہمی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ ان کی اب تک کی زندگی کا خراب ترین دور تھا اس خرابی اور جنون میں اور ان کے مشیر کاروں نے کچھ ایسے کام بھی کروائے جو عام ہوش و حواس کے عالم میں وہ کبھی نہ کرتے۔ وقت بدلا تو وہ پروفیسر بھی ہوئے اور صدر شعبہ بھی اور پھر وہ لوگ بھی ان کے قریب آ گئے جو ان کی پروفیسری کے خلاف تھے، البتہ ہم جیسے شاگرد ان کے دورانِ صدارت دور دور ہی رہے۔ لیکن یہ دوری اس وقت معدوم ہو گئی جب وہ ریٹائر ہو گئے اس لیے کہ ہمیں تو ان کی ذات سے پیار تھا ان کے اندر کے فن کار سے لگاؤ تھا۔ احترام تھا۔ اس درمیان ان کی گھریلو زندگی بھی متاثر ہوئی ان کی دوسری بیوی جنھیں ہم کوثر آپا کہتے تھے ذہنی طور پر بیمار ہو گئیں، اس کے اثرات بھی قاضی صاحب پر پڑے۔

ہم نے ان کی پریشانیوں کو بہت قریب سے پڑھا۔ ہم خود بھی پریشان ہوئے، پریشانی بانٹنے کی فکر بھی کی۔ لیکن یہ قاضی صاحب کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ ان تمام طوفانوں کو برداشت کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس درمیان انھوں نے بہت کم لکھا۔ ایک ضد میں ''حضرت جان'' جیسا ناول لکھ گئے جو کامیاب نہ ہو سکا۔ تخلیق و تحریر کے اعتبار سے یہ ان کا کمزور دور تھا۔ ان کو جو کچھ لکھنا تھا، ۷۰ء سے قبل لکھ چکے تھے۔ اب وہ تقریر سے کام چلاتے تھے اور یقیناً وہ مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ حالات نے ان کے اندر جھنجھلاہٹ ضرور پیدا کر دی تھی لیکن جھنجھلاہٹ بے باکی اور صاف گوئی میں ڈھل کر ان کی تقریر کا خوبصورت حصہ بن گئی۔ پہلے وہ شاعری کے خلاف تو بولتے ہی تھے اب تنقید کے خلاف بھی بولنے لگے۔ ان کا یہ جملہ بے حد مشہور ہوا:

''اردو تنقید نے اردو افسانے کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو کیکیئی نے رام کے ساتھ کیا تھا۔''

یا

''کسی اس شاعر کا نام بتایئے جسے پیغمبری ملی ہو۔''

ان کی باتیں ان کی تقریریں دلچسپ اور معلوماتی تو ہوتی ہی تھیں اردو سامعین پر نشتر بھی لگاتی تھیں۔ ادیبوں و شاعروں کو شرمسار بھی کرتی تھیں کہ اردو والوں میں غیبت اور منافقت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جارہی تھی۔ گورکھ پور ریڈیو اسٹیشن پر طارق چھتاری نے افسانے سے متعلق جو پروگرام کیے اس میں انھوں نے افسانے کے فن سے متعلق جو تقریریں کیں وہ یادگار تھیں۔ اس سیمینار میں ہندی کے بڑے بڑے افسانہ نگار بھی موجود تھے قاضی صاحب کی تقریروں سے وہ جھوم جھوم اٹھے، کہ اس نوعیت، اس صداقت اور بلاغت کے ساتھ تقریر ہندی میں کہاں۔ چناں چہ دیکھتے دیکھتے ہندی دنیا جو قاضی صاحب سے پہلے سے بھی واقف تھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھانے لگی اور ان کی چیزیں ہندی میں بھی آنے لگیں اور میرا خیال ہے کہ ہندی میں جتنے مقبول و معروف قاضی صاحب ہوئے ان کے ہم عصروں میں کوئی اور نہ ہوسکا۔

۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو عصمت چغتائی کا انتقال ہوگیا۔ جنوری ۱۹۹۲ء کی بات ہے، دہلی اردو اکادمی نے ''عصمت چغتائی اور نیا اردو افسانہ'' کے عنوان سے سہ روزہ سیمینار کا اہتمام کیا۔ بے شمار نئے افسانہ نگار بلائے گئے، ساتھ ہی ساتھ کچھ سینئر بھی۔ مثلاً قاضی عبدالستار، جوگیندر پال، رتن سنگھ، کلام حیدری وغیرہ بھی تھے۔ اور پرانی نسل کے لوگوں میں حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری وغیرہ بھی سیمینار میں شریک ہوئے۔ وہ ایک یادگار اور تاریخی سیمینار تھا جس کے مہتمم خاص قمر رئیس صاحب تھے۔ ایک اجلاس کی صدارت قاضی صاحب کو کرنی تھی اور عصمت کی زبان پر انھیں مقالہ پڑھنا تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا کہ ان دنوں وہ تقریر سے زیادہ کام چلاتے تھے۔ چناں چہ اس سیمینار میں بھی انھوں نے تقریر ہی کی لیکن وہ ایک یادگار تقریر تھی۔ پہلے تو انھوں نے میر امن، رجب علی بیگ سرور کے اسلوب پر باتیں کیں، اس کے بعد آزاد، شبلی وغیرہ کی انشاء پردازی کی خوبیاں بیان کیں۔ ان حوالوں سے جب ایک بے حد خوبصورت اور معنی خیز پس منظر تیار ہوگیا، تب عصمت کی نثر پر بڑے اعتماد سے بولے۔

''عصمت نے عورتوں کے جو محاورے دیے ہیں اور اسلوب کی نئی قلم لگائی ہے، اس سے اردو ادب خالی تھا۔ اس سے قبل نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ نے عورتوں کے محاورے لکھے تھے، لیکن جلد ہی وہ ہانپ جاتے تھے۔ لیکن عصمت نے بے تکان لکھا وہ صدہا صفحات لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے کردار سے زیادہ ان کے مکالمات مضبوط ہیں۔ عصمت کو مکالمات پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی ساری انفرادیت ان کی زبان کے طلسم پر ہے۔ لفظ ان کا میڈیم ہے، جیسے مصور کا میڈیم رنگ ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیقی زبان کے بغیر افسانہ ہوسکتا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ اپنی رائے پر دوبارہ غور کریں... ساری دنیا کے عمدہ افسانہ نگاروں نے اگر سیکڑوں کہانیاں لکھی ہیں تو درجن بھر کہانیاں ہی زندہ رہتی ہیں۔ عصمت کی درجن بھر کہانیاں زندہ رہیں گی ''لحاف'' ان میں نہیں آتی۔ لوگوں نے عصمت کی عمدہ کہانیاں پڑھی نہیں ہیں۔ ''لحاف'' کو شہرت ان کو کم نصیب کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ عصمت کے ساتھ تنقید نے

سنجیدگی نہیں برتی اور آج بھی یہی صورت ہے۔ عصمت، بیدی، منٹو میں سے ہر ایک پر نصف درجن کتابیں لکھی جانی چاہیے تھیں لیکن افسوس کہ یہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اس سے زیادہ بدنصیبی کہ اردو زبان میں پیدا ہوئے۔ افسانے کی تنقید مشکل کام ہے۔ تنقید کی تن آسانی اور افسانے کی مشکل پسندی نے افسانے کو تنقید سے دور رکھا...''

میں علی سردار جعفری کے بغل میں بیٹھا اس سیمینار کی رپورٹ تیار کر رہا تھا جو بعد میں رپورتاژ کی شکل اختیار کر گئی۔ مجھے تیزی سے لکھتا دیکھ کر جعفری صاحب بولے۔ ''ٹیپ کر لیتے بھائی، بہت اچھی تقریر کی ہے قاضی صاحب نے۔'' سردار جعفری جو خود بہت بڑے مقرر اور مفکر تھے ان کی تعریف ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقریر اور مقالوں کے بعد بحث بھی ہوئی تھی اور میں نے بھی کچھ عرض کرنے کی جسارت کی تھی۔ ''ہر تخلیق کار کا اپنا ایک میدان ہوتا ہے اصل خلاقی تو وہاں دکھاتا ہے اور جہاں اِدھر اُدھر ہوا بہکنے لگتا ہے، کم لوگ ایسے ہیں جو بیک وقت کئی موضوعات اور لب ولہجہ پر قدرت رکھتے ہوں۔'' قاضی صاحب کسی ضرورت سے باہر جانے لگے ان کو جاتے دیکھ کر میں نے کہا تھا۔ ''چوں کہ قاضی صاحب باہر تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی بات کی تائید میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ خود قاضی صاحب کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ خطۂ اودھ، زوال پذیر جاگیردارانہ ماحول۔ جب وہ اس میدان سے باہر نکلتے ہیں تو ان کا قلم تھکنے لگتا ہے۔'' قاضی صاحب رکے، سنا اور پھر باہر چلے گئے۔ کچھ لوگوں نے میری باتوں سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ آخر میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے قاضی صاحب نے فرمایا تھا:

''میں اپنے خوردوں کا خاصا لحاظ کرتا ہوں، بزرگوں کا نہیں۔ فاطمی کو میرے سامنے کہنا چاہیے۔ جوش نے کہا تھا کہ ''میری تخلیقات شہر کے بچے ہیں اگر زندہ رہیں گے تو کھیلیں گے ورنہ مر جائیں گے...'' میں وہاب اشرفی کا جواب نہیں دوں گا کہ میں ہندوستان کی جمہوریت کا مغرور شہری ہوں۔ اس لیے بحث نہیں کروں گا... نثر کا سب سے بڑا اعجاز پیراڈاکس (Paradox) میں ہے۔ اور پیراڈاکس میں لکھنا بہت مشکل ہے۔ اردو کے چند ادیب ہی ایسی نثر لکھ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت آزاد، شبلی، منٹو، عصمت، اور رشید احمد صدیقی کے یہاں ملتی ہے... اردو افسانے کی تنقید ٹھٹھر گئی ہے، کم زبان ہو گئی ہے۔ شعر کی عظمت کے وقت تقریر کی بات نہ کیجیے، خطابت کی بات کیجیے پھر فیصلہ کیجیے۔''

اور قاضی صاحب بہتے چلے گئے آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اب وہ، وہ قاضی صاحب نہیں لگ رہے تھے جو تھوڑی دیر قبل ایک سنبھلی ہوئی متوازن تقریر کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی تقریر میں خطابت کم للکار زیادہ تھی۔ ہم میں سے کسی نے ان کی انا کو چھیڑ دیا تھا اور وہ انانیت انھیں بولنے پر مجبور کر رہی تھی، پھر یہ بھی ہے، کہ سیمینار میں جو بات زور سے کہی جائے فوری طور پر وہی سچ ہوتی ہے۔ بعد کا سچ خواہ کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن سیمینار میں کئی مقالے، تقریریں اور افسانے پڑھے گئے تھے جن پر خوب بحثیں بھی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ہم سب بہت تھک گئے تھے لیکن یہ بھی ہوا کہ پورے سیمینار میں نوجوانوں نے بازی مار لی تھی جس سے ہم سب بہت خوش تھے۔ خوشی میں ہم سب طارق چھتاری کے گھر کی طرف چل پڑے، جو ان دنوں نیو فرینڈز کالونی میں رہتا تھا اور دہلی ریڈیو پر آفیسر تھا۔ ہمارا قافلہ پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، انجم عثمانی، فرحت احساس، سلام بن رزاق، ساجد رشید اور طارق پر مشتمل تھا، جس کی

سربراہی قاضی صاحب فرمارہے تھے۔ جن کی تقریر سے ہم سب بہت خوش تھے اور پیار و اصرار سے ان کو اپنے ساتھ لے آئے تھے اور وہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ آ بھی گئے۔ ان کو کہیں جانا تھا لیکن وہ ایسی کئی شامیں اپنے شاگردوں اور صحبتوں کے لیے قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی اسی ادا پر تو ہم جان چھڑکتے تھے۔ ہم سب بے حد موڈ میں تھے قاضی صاحب کچھ زیادہ ہی۔ ایک تو اپنی کامیابی اور دوسرے شاگردوں کی کامیابی۔ دہلی جیسے شہر میں ان کے شاگرد انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے، ہر طرح کا انتظام کرتے لیکن اس دن سارا انتظام خود قاضی صاحب نے کیا تھا۔ کھانے سے لے کر پینے تک۔ اس لیے کہ وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے۔ ان کے اس شفقت آمیز موڈ کا پہلا شکار میں ہی ہوا۔

''دیکھیے فاطمی صاحب! آپ نے شرر پر کام کیا ہے ان کے سارے ناول پڑھے ہیں، لیکن کیا وہ تاریخی ناول لگتے ہیں۔ کیا شرر ایک ناول کو بھی تاریخی زبان دے سکے ہیں۔ دربار یا جنگ کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ کیا وہ جانتے تھے کہ تاریخ لکھنے کی کیا زبان ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پڑھیے ''داراشکوہ'' اور ''صلاح الدین ایوبی''....

''جی میں نے پڑھے ہیں یہ ناول۔'' میں نے مودبانہ عرض کیا۔

''یقیناً آپ نے پڑھے ہوں گے اور آپ کو پڑھنا بھی چاہیے اور یہ سب چیزیں پڑھے جانے کے قابل ہیں۔''

قاضی صاحب کچھ اور بھی فرماتے رہے، میں یہ سوچتا رہا کہ اچانک شرر کا ذکر کیوں۔ پھر جلد ہی سمجھ میں آ گیا کہ معاملہ اسلوب کا ہے۔ اس کی رنگارنگی کا ہے ساتھ ہی صبح والی بات کی وضاحت کا بھی۔ میں نے صرف اتنا ہی عرض کیا:

''شرر کے ناول تاریخی کم رومانی زیادہ ہیں پھر اس وقت ناول نویسی کا وہ شعور پروانہ نہ چڑھ سکا تھا۔''

قاضی صاحب تھوڑا نرم ہوئے پھر بھی کچھ دیر تک اسی قسم کے موضوعات پر بے حد خوب صورت اور پرمغز گفتگو کرتے رہے اور ہم تمام لکھنے والوں کا حلقہ ہمہ تن گوش تھا۔ ان کی خدمت میں مودب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمارے استاد تو تھے قاضی بھی اور مفتی بھی۔ مفتی اس لیے کہ اس وقت انھیں کی وجہ سے وہ دعوت ہمیں نصیب ہوئی تھی۔ جب سب بیٹھ گئے تو قاضی صاحب نے زیرلب تبسم فرما کر کہا۔ ''ذرا فاطمی کا کلاس لے رہا تھا یہ بھی میرے شاگردوں کی طرح ہے۔''

''یقیناً آپ میرے استاد ہیں۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میرے دل میں آپ کے لیے بے حد احترام ہے۔'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

''مجھے معلوم ہے، اسی لیے تو میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔ ویسے فاروقی (پیغام آفاقی) بھی میرے براہ راست شاگرد نہیں ہیں۔ یہاں شاگردوں میں خورشید، طارق، غضنفر اور اشرف ہیں۔ لیکن میں فاروقی کو بھی اپنا شاگرد مانتا ہوں۔''

''ہم سب آپ کے شاگرد ہیں اور ہم آپ کی بے حد قدر کرتے ہیں اور آپ کا یہ بڑکپن ہے کہ آپ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کو نوازتے ہیں۔'' سلام بن رزاق نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ قاضی صاحب نے بڑی محبت سے ہم سب کو مخاطب کیا اور بولے:

''مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ لوگ آج کے سیمینار میں ہی نہیں بلکہ آج کے ادب میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور بزرگوں کے

رعب و داب میں آئے بغیر اپنی باتیں کہہ رہے ہیں۔ میں نے بھی یہی کیا تھا۔ آپ اپنی بات کہیے اس میں ذرا بھی ہچکچایئے نہیں۔ مائک چھین کر اپنی بات کہیے۔ ہٹا دیجیے سب کو اپنی راہ سے۔ ڈائنامک ہونے کی ضرورت ہے۔ میرے لیے ایک استاد کے لیے اس سے بڑھ کر اور خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ میرے خوردوں، میرے شاگردوں میں اتنا حوصلہ اور اتنی طاقت آ چکی ہے کہ وہ اپنی آواز میں اپنی بات کہہ سکیں اور ان کی آواز نہ صرف سنی جائے بلکہ حاوی رہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ نسلیں آتی ہیں ان میں جو لوگ کمزور ہوتے ہیں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جاتے ہیں لیکن جن میں جان ہوتی ہے وہ سر اٹھا کر اپنی بات کہتے ہیں اور منواتے ہیں۔ آج آپ لوگوں نے جس حوصلے اور جوش و خروش سے اپنی بات کہی ہے یہ آپ کا حق ہے... یہ کیا کہ آپ جی رہے ہیں چوہوں کی طرح۔ آپ کیا ہیں صاحب۔ اردو کے شاعر ہیں۔ مرے کھپے شاعر...''

میں نے بات کا رخ بدلا اور عرض کیا:

''یہ دیکھیے قاضی صاحب غضنفر آپ کے شاگرد ہیں!''

''جی ہاں میرے شاگرد ہیں۔ اگر ان کو کوئی اعتراض نہ ہو!''

''اردو اکادمی نے ان سے بھی مقالہ لکھنے کو کہا تھا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ سردی بہت ہے۔'' میں نے بات میں گرمی پیدا کرنی چاہی۔

''آپ نے تو اس عمر میں بھی بڑے بڑوں کے...'' میں نے لقمہ دیا۔

''شیر کی طرح جینا چاہیے۔ گیدڑوں کی طرح نہیں۔ ہاں تو جناب آپ کی عمر شریف؟''

''وہ۔ وہ قاضی واقعی بہت سردی پڑ رہی ہے، پھر میں باقاعدہ نقاد نہیں ہوں۔'' غضنفر استاد کے سامنے منمنائے۔

''یہ نقاد کیا ہوتا ہے۔ کس کھیت کی مولی ہوتا ہے۔ آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔'' پھر قاضی صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''معاف کیجیے گا آپ میں سے کوئی نقاد تو نہیں...''

''یہ فاطمی اور خورشید ہیں...'' انجم عثمانی نے شرارتاً جلدی سے ہمارے نام لے لیے۔

''نہیں خدا کے فضل سے یہ لوگ نقاد نہیں ہیں۔ خورشید میرے شاگرد ہیں اور فاطمی بھی شاگرد ہی ہیں اور جو میرے شاگرد ہیں وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں نقاد نہیں۔ ہاں تو صاحبزادے آپ کو مقالہ لکھ کر آنا چاہیے تھا اپنی بات کہنی چاہیے تھی۔''

''دیکھو نا بھائی ہم لوگ بھی تو لکھ کر لائے ہیں اور پڑھیں گے۔'' ساجد رشید نے فتح کا اعلان کیا اور نقاد کو شکست دے دی۔

قاضی صاحب کے تنقید کے خلاف حملے زمانہ بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ اگرچہ کسی زمانے میں انھوں نے اس میدان میں خامہ فرسائی کی تھی اور اردو شاعری کی قنوطیت پر باقاعدہ کتاب لکھی اور چھپوائی۔ جمالیات پر بھی ایک کتاب لکھی۔ افسانے کی تنقید پر بھی ان کے مضامین ہیں۔ لیکن اس میدان میں زیادہ بات بنی نہیں۔ قاضی صاحب پھر بولے:

''دیکھیے صاحب معاملہ یہ ہے کہ ترقی پسندوں میں صف اول کا کوئی نقاد ہے ہی نہیں۔ تخلیق کار صف اول کے ضرور ہیں۔ ان پر

صف سوئم کے نقادوں نے تنقید کر کے صف دوئم میں آ کھڑے ہوئے اور شمار ہوا صف اول کے نقادوں میں۔ ہمارے یہاں جتنے بھی بڑے نقاد ہیں وہ سب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ حالی، شبلی، آزاد سب شاعر ہیں۔ آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری پہلے تخلیق کار ہیں اس کے بعد نقاد۔ احتشام حسین بھی شعر کہتے تھے باقاعدہ شعر کہتے ہوئے پکڑے گئے۔ اردو تنقید بانجھ عورت کی طرح ہے۔ کمزور اور لجلجی ہے۔'' اور قاضی صاحب پوری ترنگ میں اردو تنقید کی تواضع کرتے رہے۔ ایسی تواضع وہ اکثر کرتے رہے ہیں۔ وہ شام ایک یادگار شام تھی۔ ایک حسین اور کبھی نہ بھلائی جانے والی شام۔

یہ محض ایک واقعہ کی روداد ہے یا قاضی صاحب کی شخصیت کی کج کلہی اور کج ادائی کی ایک جھلک۔ ان کے بے باک فکر و خیال ان کی تخلیقی نوعیت کا تقریر و تحریر۔ ان کی فن کارانہ گل افشانیٔ گفتار۔ ان کے اقدار۔ ان کے کردار کے ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں کہ اگر ان کو لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب تیار ہو جائے۔

۷۸ء میں ہم لوگوں نے الہٰ آباد میں نئی کہانی پر بڑا سیمینار کیا تھا جس میں افتتاح کرتے ہوئے قاضی صاحب نے افسانے کے فن پر بہت اچھی تقریر کی تھی۔ اسی طرح خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سیمینار کی تقریر۔ مجھے ان سے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ذاتی محفلوں میں بھی جس طرح کی علمی گفتگو کرتے، اس میں تخلیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا رنگ ہوتا۔ اگر ان کے مضامین، تقریریں، انٹرویوز وغیرہ جمع ہو جائیں تو یقین ہے کہ فن افسانہ سے متعلق وہ ایک بے حد کارآمد اور معیاری کتاب ہو سکتی ہے۔

بہر حال ہم شاگردوں سے ان کی محبتیں، انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان وابستگی، پھر اس سے روٹھ کر جن وادی لیکھک سنگھ میں چلے جانا اور ترقی پسندوں کو بھلا برا کہنا، قمر رئیس، سید محمد عقیل، اقبال مجید، عابد سہیل، رتن سنگھ جیسے ہم عصروں سے ان کی محبت اور دوستی، سردار جعفری، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کی نفرت اور دشمنی، احتشام حسین، محمد حسن جذبی، عصمت، قرۃ العین حیدر، اشک وغیرہ کے تئیں ان کا احترام، ان سب کے الگ الگ رنگ تھے اور الگ الگ انداز۔ لیکن معاملہ احترام و عقیدت کا ہو یا محبت و نفرت کا قاضی صاحب کے تمام طرح کے رویوں میں ایک مخصوص شدت اور وحدت رچی بسی ہوتی۔ وہ دوستی بھی دشمنی کی طرح کرتے، اور دشمنی بھی دوستی کی طرح۔ ان سب کی کہانیاں یکساں ہیں، لیکن ہیں بے شمار جن کی تفصیل میں جانا فی الوقت ممکن نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ جو بھی کرتے اس میں ریاکاری اور مکر و فریب دور دور تک نہ ہوتا۔ ان کا اندرون اور بیرون ایک ہے، دوہری شخصیت تو ان کو چھو بھی نہیں گئی۔

بہر حال قاضی صاحب اپنی منفرد، انوکھی، البیلی شخصیت اور سادگی بھرے کردار کی وجہ سے اور سب سے بڑھ کر اپنی بے باک گوئی کی وجہ سے اپنی زندگی میں خود ایک افسانہ بن گئے۔ وہ جتنے مقبول اور ہر دل عزیز ہیں اس میں ان کی شخصیت کی گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ ان کی کڑواہٹ کا بھی بڑا دخل ہے۔ ان کی گفتگو میں رسیلے پن کے ساتھ ساتھ ایک نوکیلا پن بھی ہوا کرتا۔ کل ملا کر ان کی شخصیت اس کانٹے کی طرح تھی جو گلاب کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ ساتھ کھلتا ہے اور نسیم بہار اس کی بھی اسی طرح پرورش کرتی ہے، جس طرح گلاب کی پنکھڑیوں کی۔ ان کی شخصی اور تخلیقی دونوں اسلوب کو ان کیفیتوں سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔

میں نے یہاں ان کے افسانوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں ان کے افسانوں کا جتنا عمدہ قاری ہوں، فکری اور

نظریاتی طور پر اتنا ہی نکتہ چیں بھی۔ اس لیے ان کے افسانوی ادب پر پھر کبھی عرض کروں گا، لیکن علی گڑھ کے تعلق سے یہ بات ضرور عرض کرنا چاہوں کہ انھوں نے اس علمی شہر میں کئی دہائیاں گزاریں اور ان کے فکر و شعور کا بڑا حصہ اسی شہر میں پروان چڑھا لیکن سیتاپور مچھر ہٹہ ان سے کبھی الگ نہ ہوسکا۔ اکثر علی گڑھ والوں کی علی گڑھ کمزوری ہوتی ہے لیکن قاضی صاحب کی کمزوری علی گڑھ نہ تھی بلکہ اگر میں یوں کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ جس زمانے میں وہ شدت سے ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھے اس کی ایک وجہ علی گڑھ بھی تھی۔ اگرچہ ان کے کچھ بہت اچھے شاگرد حق شاگردی ادا کرتے رہے اور ان کی پریشانیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن وہ ان کے دل و دماغ اور گھر کی پریشانی کس طرح تقسیم کرتے۔ ابھی تک آخری بار جب میری دعوت پر الٰہ آباد آئے تو میں نے بھی یہی بات محسوس کی۔ میں نے ہر طرح سے ان کی خدمت اور دلجوئی کرنے کی کوشش کی، اشک صاحب کے بیٹے نیلابھ کے ساتھ شام کا اہتمام کیا۔ اس شام قاضی صاحب نے اشک صاحب کو بہت یاد کیا تقریباً آبدیدہ ہو گئے، پھر پیار سے نیلابھ کو ڈانٹنے بھی لگے، پھر اسی کیفیت میں اپنے گھر اور بیٹے کے حالات بیان کیے۔ ہم سب ان کے دکھوں کو سنتے رہے کہ سوچتے رہے کہ یہ بدنصیبی صرف ہندوستان اور بالخصوص اردو کے ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔ الٰہ آباد سے رخصت ہونے لگے تو مجھے گلے سے لگایا اور پھر مچھر ہٹہ چلے گئے کہ وطن جانا ان کی مجبوری تھی۔ قاضی صاحب ادھر کافی عرصے سے اپنے اصل وطن میں ہی رہ رہے ہیں۔ وہ ادب اور آج کی اردو دنیا سے تقریباً کٹ چکے ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں اور تقریروں، ان کے افسانے اور ناول پورے رنگ و آہنگ اور گھن گرج کے ساتھ پڑھے جاتے رہیں گے۔ آج بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ الٰہ آباد آئیں گے۔ میرے یہاں کھانا ضرور کھائیں گے لیکن قیام ضیاء الاسلام کے یہاں کریں گے۔ میرے شاگردوں سے ملیں گے اور اسی انداز اور لب و لہجہ سے کہیں گے:

''فاطمی میرا شاگرد تو نہیں ہے لیکن شاگرد کی طرح ہے۔ میں اسے بہت عزیز رکھتا ہوں۔ یہ فکشن پڑھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ ادب پڑھنا ہے لکھنا ہے تو پہلے سچ بولنا سیکھو۔ چاپلوسوں کو ذلیل کرو اور پڑھو خوب پڑھو۔ جس نے آزاد، شبلی، آزاد، قرۃ العین حیدر وغیرہ کو نہیں پڑھا تو اسے ادب نہیں پڑھنا چاہیے۔ اسے گھاس چھیلنا چاہیے۔''

زندگی بھر اپنے سخت، صداقت آمیز اور بے باکانہ جملوں اور رویوں کی وجہ سے قاضی صاحب نے جتنے دوست بنائے اس سے زیادہ دشمن بنائے۔ ان کے دشمن بھی کئی طرح کے ہیں۔ کوئی انھیں افسانہ نگار ہی نہیں مانتا۔ کسی کی نظر میں وہ ایک معمولی افسانہ نگار ہیں اور بعض انھیں بزعم خود غلط اور کمزور انسان سمجھتے ہیں۔ لیکن سچائی تو ان سب تعصبات سے دور اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اردو افسانے کی کوئی بھی تاریخ اور کوئی بھی فہرست ایسی نہ ہوگی جس میں قاضی صاحب کے افسانے اور ناول شامل نہ ہوسکیں۔ جہاں تک ان کی شخصیت کی کج ادائی اور کھرے پن کا سوال ہے تو میں یہی عرض کروں گا کہ خلوص سے قاضی صاحب کے باطن میں جھانکیے اور جوش کا یہ شعر پڑھیے:

کانٹوں کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

حسن ظہیر

جمیل الدین عالی کا طویل نظمیہ ''انسان''...ایک تاثر

جمیل الدین عالی عہد بھی ہیں اور عہد ساز بھی۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور ہر جہت اپنے اندر انفرادیت کے پہلو رکھتی ہے۔ وہ شاعر ہیں، ادیب ہیں، اظہار نویس ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک دردمند انسان اور حقوق العباد کے پرچارک بھی۔ زندگی کی آٹھ سے زائد دہائیاں گزار کر بھی نہ صرف وہ اپنی تخلیقی زندگی میں انتہائی پُرجوش اور پُرعزم ہیں بلکہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی ان کا ایک فعال اور متحرک کردار سب کے سامنے ہے۔ چالیس برسوں سے زائد عرصے پر محیط ان کی کالم نویسی، جسے انھوں نے اظہاریہ نویسی قرار دیا ہے، کا سفر باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے جو دراصل پاکستان کی تاریخ کے طور پر محفوظ ہوتا جاتا ہے۔

عالی جی کا عشق پاکستان ہے اور وہ اپنی شناخت کو پاکستان سے منسوب کرتے ہیں۔ رجائیت ان کے مزاج کا حصہ ہے اور وہ جیوے جیوے پاکستان کی تان اٹھاتے رہتے ہیں۔ ادارے بنانا اور پھر ان اداروں کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانا بھی ان کی ذات کا حصہ ہے۔ رائٹرز گلڈ کا خیال ہو یا پھر انجمن ترقی اردو یا پھر اردو یونی ورسٹی، وہ ہر ادارے کو مستحکم اور ارتقا پذیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں موضوع جمیل الدین کی شخصیت نہیں بلکہ ان کا وہ تخلیقی کارنامہ ہے جو بہت سے حوالوں سے انتہائی منفرد ہے۔ حالیہ دنوں میں ان کا طویل نظمیہ ''انسان'' شائع ہوا ہے۔ ''انسان'' جمیل الدین عالی کا ایک خواب تھا جو نصف صدی سے دیکھ بھی رہے تھے اور ان کی تعبیر میں رنگ بھرنے کے لیے اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔ عالی جی کا یہ طویل نظمیہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس کے مختلف حصے مختلف ادبی رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اب جب کہ سات ہزار آٹھ سو مصرعوں پر مشتمل یہ نظمیہ شائع ہو گیا تو بھی عالی جی نے اسے نامکمل ہی قرار دیا ہے۔ تاہم، اس معاملے پر وہ پروفیسر سحر انصاری کی بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جب انسان تاحال مکمل نہ ہو سکا تو جمیل الدین عالی کا طویل نظمیہ ''انسان'' کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔

کتاب کے ناشر کا کہنا ہے کہ عالی صاحب نے تقریباً تین ہزار مصرعوں کی اشاعت روک دی ہے، جس کے بارے میں عالی جی نے بعد اصرار راقم کو بتایا کہ یہ مصرعے ان کے انتقال کے بعد شائع کیے جائیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی ممکنہ تنازعے سے گریز کرنا چاہتے ہیں اور یہ مصرعے اور ان کے موضوعات کو فی الحال پاکستانی معاشرہ آسانی کے ساتھ ہضم اور قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

جمیل الدین عالی نے جب ابتدا میں انسان لکھنا شروع کیا تو وہ بہ ظاہر اپنی ساخت میں ایک منظوم تمثیل کی صورت میں تھا۔ جمالی مرکزی کردار تھا اور اس کے گرد دیگر کرداروں کے نسبت کے ساتھ مکالمے کا تسلسل تھا اور مباحث تھے۔ مگر جوں جوں جمیل الدین عالی اپنے مطالعے، مشاہدے اور ادراکِ زندگی کو وسعت دیتے گئے، انسان کی پرتیں بھی کھلتی گئیں اور کائنات کے اسرار و رموز، انسان کی ابتدا اور اس کی ارتقا پذیری، خالق اور مخلوق کے ساتھ رشتہ اور زمین اور آسمان کے درمیان تمام عجائباتِ قدرت پر وہ خود کو مرکوز کرتے گئے، اور یوں اپنے اس طویل نظمیہ ''انسان'' کا عمل انھوں نے جاری رکھا۔

جمیل الدین عالی شاعری میں غزل کی روایات کے امین ہیں مگر شاعری میں انھوں نے اختصاری صنف دوہے پر اس طرح طبع آزمائی کی کہ دو مصرعوں میں لکھی جانے والی شاعری کی اس صنف کو نئے اسلوب اور پیراہن سے نہ صرف اعتبار اور شہرت دی بلکہ اپنی انفرادیت سے دوہے کو اردو دوہے کے قالب میں بہ صورت ''عالی چال'' میں ڈھالا، اور آج وہ اردو دوہے کے تاج دار کا منصب رکھتے ہیں۔ یعنی ہم اس سے ہٹ کر چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے۔

''انسان'' کے معاملے میں بھی جمیل الدین عالی نے انتہائی جداگانہ روش اختیار کی ہے۔ اردو شاعری میں طویل نظموں کی روایت تو موجود ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنے منظوم خودنوشت بھی تحریر کی ہے، لیکن عالی جی نے اپنی فکریات، مصرعوں کی طوالت، اپنی اسلوب نگاری، موضوعات کی وسعت اور اس کی گہرائی سے اس طویل نظمیہ کو اردو شاعری کی منفرد تخلیق کا درجہ دلانے کا سامان کر دیا ہے۔ اپنی نظم ''تہجی'' میں وہ لکھتے ہیں:

خداوندا!
مجھے تو کم سے کم اتنی صدیاں اور دے
دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں، کچھ کام کر جاؤں
اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائقِ انعام کر جاؤں
نہیں میں یہ نہیں کہتا اب یا عہدِ آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے بزم گاہِ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو الف ب تھیں
یوں وہ مہلت زندگی بھی مانگتے ہیں اور تنگیِ وقت کے بھی شاکی ہیں
اور ابھی مزید کام اور کام کے آرزومند بھی

جدید اردو نظم کے پیکر میں طویل نظمیہ ''انسان'' اپنے اندر ادب، جمالیات، نفسیات، اخلاقیات، تاریخ، سائنس، مذاہب عالم، انسانی تاریخ و تہذیب و تمدن، معاشرتی ارتقا پذیری، کائناتی وجود، ظہور اور گردشِ لیل و نہار جیسے ثقل مگر پرمغز موضوعات کے گرد اپنے

مباحث لیے ہوئے ہے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے نظمیے میں تکنیک اور اسلوب کے نت نئے تجربات کیے ہیں۔ عالی صاحب ایک باعلم، صاحب دانش اور کثیر المطالعہ و مشاہدہ شخصیت ہیں۔ تحیّر کی بات یہ بھی ہے کہ ''انسان'' میں وہ سائنسی معاملات اور نظریات و فکریات پر بھی نئے اشاروں اور کنایوں میں سوچ کے متعدد در وا کرتے چلے جاتے ہیں۔

''انسان'' کے طویل مصرعوں، اس کے موضوعات اور اس کے مندرجات کے ساتھ ساتھ تکنیک اور اسلوب اور حرفوں کے برتنے کے حوالے سے ہمارے ناقدین ادب نے گو ابھی اپنے ابتدائی تاثرات دیے ہیں مگر اس طویل نظمیہ کی ادبی قامت کا ابھی تعین ہونا ہے مگر پھر بھی اس مرحلے پر کہ، ابھی جمیل الدین عالی کی اس تخلیق پر طویل مطالعہ بھی ہونا ہے اور مباحثے بھی، یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری میں جدید اردو نظم کے باب میں یہ ایک قابلِ فکر کارنامہ ہے اور جیسے انسان کے اسرار کلی سے تاحال واقفیت سے محرومی ہے، ویسے ہی جمیل الدین عالی کے طویل نظمیے ''انسان'' کی دریافت میں بھی شاید ایک طویل مدت درکار ہو۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے سنجیدہ اور فہمیدہ ادبی حلقوں میں نہ صرف عالی جی کے اس نظمیے کی پڑھت کا سلسلہ شروع کیا جائے بلکہ باب در باب اور مصرعہ در مصرعہ مباحث اور مکالموں کا بھی انتظام ہوتا کہ کسی تخلیق کار کے اس نصف صدی کے خواب اور اس کی ریاضتوں اور تخلیقی مسافتوں کی حاصل اس تعبیر کو سمجھا بھی جاسکے اور سمجھایا بھی جاسکے۔ جمیل الدین عالی خوش قسمت ہیں کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی قیمتی ترین متاع زندگی کی صورت گری بھی کر سکے اور وارثان اردو ادب کو منتقل بھی کر سکے۔ جمالیات پرست جمیل الدین عالی کی کتاب اپنے طباعتی اور نظری حوالوں سے بھی ناشر و شاعر راغب نے ''مکتبہ ہم زبان'' کے زیر اہتمام خوب صورتی سے چھاپی ہے۔ طویل ضخامت کے باوجود اس کتاب کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔

(بہ شکریہ: روزنامہ ''ایکسپریس''، سنڈے میگزین، ۲؍مارچ ۲۰۰۸ء)

غالب کے چند پہلو

از

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

توازن کی جہات

ترتیب و انتخاب: ڈاکٹر قاضی عابد

صفحات: ۳۶۱، قیمت: ۲۵۰ روپے

شعبہ اردو بہاالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

مبصر: رؤف نیازی

''توازن کی جہات'' ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے منتخب تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انتخاب و ترتیب کا فریضہ ڈاکٹر قاضی عابد نے انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ ترین نے اسے شعبہ اردو کی جانب سے بہاالدین زکریا یونی ورسٹی ملتان سے شائع کرایا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ممتاز ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے نمایاں پہچان رکھتے ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے علمی ادبی موضوعات کو اپنی فکری اور نظری صلاحیتوں کی روشنی میں پرکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے ربع آخر کے شروع ہی میں اردو ادب کی لسانیات کے نئے فکری ابعاد کو جو ساختیات اور پس ساختیات کی عطا ہیں متعارف کرایا۔ مرتب نے ان کی مختلف کتابوں سے مضامین کا انتخاب کر کے انھیں چھ ذیلی عنوانات نظر تنقید، شاعری کا دیار، افسانے کا جہان، مغربی دریچے، ادبی تاریخ کے جھروکے اور سرسید، غالب، اقبال اور جوش کے تحت کل تینتیس مضامین کو شامل اشاعت کیا ہے۔ یہ مضامین ان کی کثیر الجہتی اور تنقیدی بصارت اور بصیرت پر دال ہیں۔

ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے، ''ممتاز حسن نے ایک مصاحبے میں کہا تھا کہ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جو پورے کلچر کا نقاد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی بلاشبہ ایسے نقاد ہیں جو اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔'' ہمیں اس رائے سے اتفاق ہے، اس لیے بھی کہ اپنی علمیت و بصیرت سے قطع نظر ان کا رویہ غیر ترقی پسندوں کے ساتھ بھی معاندانہ نہیں بلکہ دوستانہ ہے وہ اس حقیقت سے محض آگاہ ہی نہیں بلکہ علم بردار ہیں کہ کوئی فکر آخر فکر نہیں ہوتی اور نہ کوئی حرف، حرف آخر۔ بلاشبہ انھوں نے مغرب کے نئے انتقادی نظریات کو اس وقت اردو ادب سے متعارف کرایا جب کہ ان کے خدوخال پوری طرح واضح بھی نہیں ہوئے تھے۔ پچیس تیس سال گزر جانے کے بعد اب صورت حال بڑی حد تک واضح ہو چکی ہے۔ تنقید کا عالمی منظر نامہ قطعی طور پر بدل چکا ہے۔ ترقی پسندی میں تو تاریخیت کا توسیعی باب،

نسوانی تنقید اور مابعد جدیدی نقطۂ نظر وغیرہ اپنا اثبات کرا رہے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر انوار احمد اپنے پیش لفظ میں ''توازن'' مطبوعہ ۱۹۷۶ء اور ''جہات'' مطبوعہ ۲۰۰۴ء کے تناظر میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے نظر آتے ہیں:

''وہ فکری قطبین اور پرجوش جانب داری کے زمانے میں کوشش کریں گے کہ ان کے تنقیدی تجزیے
توازن کی مثال قائم کیے چلے جائیں۔''

اور ''جہات'' کے ''حرفے چند'' کے تعلق سے وہ رقم طراز ہیں:

''ردتشکیل کسی فلسفے کا نام نہیں، یہ صرف متن فہمی کی ایک تکنیک ہے... معانی کا Logocentric system دریدا کے لیے بس کی گانٹھ ہے۔ اس کی بنیاد جس پیراڈائم (نظام استدلال اور نظریات) پر ہے، وہ اپنی منطق اور مستقل معنی کے نظام کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ نظام ہے۔ جو Text کی اضافیت پر یقین رکھتا ہے۔ اور اس طرح الہامی صحائف Deconstruct ہونے کے بعد کچھ سے کچھ متن جنم دے سکیں گے جو مذہب کے لیے ناقابل قبول سعی ہوگی۔ ممکن ہے کہ قارئین میری آرا سے اختلاف کریں، یہ ایک جمہوری حق ہے اور میں اختلافی آرا کی روشنی
میں اپنی آرا کا ازسرنو جائزہ لوں گا۔''

لیکن ان مباحث کی روشنی میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر یہ نظام ختم ہو گیا ہے تو پھر یہ خدشات کیوں ہیں؟ اور کیا کمیونسٹ منشور میں کسی صحیفۂ آسمانی اور فلسفہ مذہب کی گنجائش اور پاس داری موجود ہے؟ ''فکری قطبین'' کی موجودگی کا اعتراف معاصر افکار کی موجودگی کا اقرار نہیں ہے؟ اور کیا یہ ''توازن'' مابعد جدیدیت کے تکثیری سماج اور ان کے باہمی احترام سے عبارت نہیں ہے؟

کہاں ہے تمنا کا اگلا قدم یارب؟

عصر حاضر کو ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر انوار احمد کی بصارت و بصیرت کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے پہلے اتنی نہ تھی۔

قران اور قانون جدید

ڈاکٹر محمد وسیم انجم

صفحات: ۲۳۲، قیمت: ۲۰۰ روپے

انجم پبلشرز کمال آباد نمبر ۳، راولپنڈی

مبصر: محمد احمد سبزواری

مصنف وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی میں شعبہ اردو کے لیکچرار ہیں۔ آپ کے پاس ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ، الیکٹریکل انجینئرنگ ڈگریوں کے علاوہ آپ نے ''اقبال کی نظر میں اسلامی فقہ کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا

مقالہ بھی تحریر کیا ہے اقبال سے آپ کو بڑی عقیدت ہے اور ان پر چار کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ایل ایل ایم کا مقالہ ہے۔ اس میں قران اور قانون جدید کے حوالے سے اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول اس کے عناصر، اس کی خصوصیات اور اسلامی ریاست اس کے بنیادی اجزائے ترکیبی، اس کے مقاصد، اسلامی قانون کا ماخذ اول۔ قران، قران وعدل، قران اور عائلی قوانین، قانون شہادت اور قران کی روشنی میں قصاص و مرتب جیسے موضوعات کا ذکر ہے۔ آخر میں بعض ملکی شرعی قوانین جیسے زِنا، لواطت، قذف، خمر یا شراب نوشی، سرقہ یا چوری، رہزنی کا ذکر ہے۔

انجم صاحب کے نزدیک قانون وارتقا کی صورت یہ ہے کہ پہلے فرد، پھر خاندان، پھر معاشرہ اور اس کے آخر میں قوانین کا مرحلہ، گویا قوانین صرف زیست کی بقا اور تحفظ کے لیے ضروری ہیں، فرد اور ریاست کے درمیان وہ قانون کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے (ص ۱۵)۔ اگر یہ صورت ہے تو پھر عائلی قوانین جیسے نکاح، طلاق، مہر، نکاح کی غیر شرعی صورتیں، طلاق کی ناپسندیدہ اقسام، عدت، ایلا، ظہار، لعان، ضلع وغیرہ جن کا قران میں بھی تذکرہ ہے اور جن کے بنیادی ضابطوں کی بھی تفصیل موجود ہے۔ وہ سب تو افراد یا زیادہ سے زیادہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور شاذ صورتوں ہی میں قاضی (عدالت) کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔

سرور انبالوی (ص ۳۰) نے تحریر کیا ہے کہ ''علمائے دین اور مفسرین ہر دور میں کلام مجید کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے تفاسیر لکھتے رہے ہیں اور نئے نئے گوشے وا ہوتے رہے ہیں۔'' ان بزرگوں نے درجنوں ضخیم جلدوں میں قرانی تعلیمات کو بیان کیا ہے تو دو سو صفحے کی کتاب میں ان سارے مسائل کا لب لباب کو ایک توضیحی انڈیکس کا نام ہی دیا جا سکتا ہے پھر اسلامی ریاست کے جو خدوخال باب دوم میں بیان کیے گئے ہیں کیا دنیا کے ۵۹/۵۱ ملکوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا جہاں مسلمان حاکم ہیں، کیا کوئی ملک متذکرہ معیار پر پورا اترنے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

بہرحال محمد وسیم صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایک اسلامی خدمت انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول کرے۔ آمین۔

تمام شب

اورنگ زیب نیازی

صفحات: ۱۲۶، قیمت: ۱۲۵ روپے

سید محمد علی معظم رضوی، اظہار سنز ۱۹، اردو زبان، لاہور

مبصر: محمد احمد سبزواری

مصنف شاعر، افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں، موصوف کی ان اصناف پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ''تمام شب'' نیازی صاحب کی ۶۳ چھوٹی اور بڑی آزاد نظموں کا مجموعہ ہے اس کے فلیپ پر محترم امجد اسلام کی رائے درج ہے ان کا ارشاد ہے کہ ''اورنگ زیب نیازی

آزاد نظم کی لکھی گئی مختصر نظموں میں زیادہ کامیاب ہے کہ وہ اندرونی قوافی اور بحر کے امکانات کے بہتر شعور کی وجہ سے ان میں ایک مخصوص قسم کی نغمگی نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ اسے آخر تک برقرار بھی رکھتا ہے اور ردھم کی رو میں بہہ کر نظم کو غیر ضروری طوالت نہیں دیتا۔'' میرے خیال مختصر طور پر اس سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کو ان کی دو نظمیں سنائے دیتا ہوں۔

رات کا آنچل پھیل رہا تھا
گھور اندھیرے اوڑھ کے بستی والے
سرد زمین میں اک چنگاری ڈھونڈ رہے تھے

دھند میں لپٹا شہر تمام
رات کا پچھلا پہر خموشی میں اور تنہائی
گلیاں سب سنسان
جاگ رہا ہے قبرستان

ایک شعر جو مجھے پسند آیا ملاحظہ ہو:

پھول، خوشبو، رنگ، تتلی، چاند، ستارے، کہکشاں
حسن کی ان رفعتوں کے آسماں تم ہی تو تھے

کلچر (مضامین)

مرتب: اشتیاق احمد

بیت الحکمت، لاہور

مبصر: پروفیسر ڈاکٹر عطاالرحمٰن

کلچر کیا ہے؟ مختلف اقوام کے نزدیک اس کا کیا مفہوم ہے ہم بطور مسلم/ پاکستانی قوم اس سے کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا ہمارا اپنا کوئی تشخص/ کلچر ہے جس پر فخر و انبساط کا اظہار کرسکیں۔ اس کا دائرہ کار کیا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد پاکستانیت سے لگا کھاتے ہیں یا محض دوسروں سے مستعار کلچر پر ہم نے اپنی بنیادیں استوار کر رکھی ہیں؟ کیا یہ بنیادیں اتنی مستحکم اور توانا ہیں کہ آنے والے نئے ''گلوبل ویلج'' کلچر کے طوفانی جھگڑوں کا مقابلہ کرسکیں۔ کیا پاکستان کی ۶۰ سالہ زندگی میں کبھی صدق دل سے اسلامی و مشرقی روایات کے پنپنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ کیا ہم علمی اور فکری سطح پر اس قابل ہو گئے ہیں کہ اقوام عالم کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ یہ اور اسی طرح کے دیگر بہت سے سوالات ہیں، جن کو جاننا سمجھنا اور ان کی گہرائی میں جھانکنا ازبس لازم ہے اور ان کا جواب پانے کے لیے سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے تب کہیں جا کر اس موضوع سے متعلقہ اذہان میں کلبلاتے سوالات کا جواب مل پائے گا۔

حال ہی میں ''کلچر'' (منتخب تنقیدی مضامین کے نام سے ایک کتاب مرتبہ اشتیاق احمد، بیت الحکمت، لاہور سے منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں مذکورہ سوالات کی گتھیاں سلجھانے کی احسن کوشش کارفرما ہے۔ کتاب میں ۶۳ عمدہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا انتخاب اس بات پر دال ہے کہ مرتب نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ ان مضامین کی قدر قیمت کا تعین کر کے شامل کتاب کیا ہے بلکہ اس کے پیش نظر قیام پاکستان کا تناظر بھی رہا ہے۔ کتاب میں شامل پہلا مضمون حسن عسکری کا ہے جن کی علمی وتنقیدی بصیرت سے کسی کو بھی انکار نہیں یہ مضمون اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ ''آفاق'' میں شائع ہوا۔ حسن عسکری نے ''الف لیلیٰ'' کو مسلمانوں کے افسانوی ادب کی مقبول عام کتاب قرار دیتے ہوئے ہند اسلامی کلچر کی آبیاری پر زور دیا ہے۔ عسکری کے نزدیک اردو ثقافتی اظہار کا ذریعہ ہے۔ ہمارا اپنا قومی کلچر ہے۔ اس سے کٹ کر ہم اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے ۱۹۴۸ء میں کہی گئی بات کا اگر ہم غیر جانب دارانہ طور پر جائزہ لیں تو بے ساختہ یہ ضرب الامثال صادق آتی ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ آج سرحد پار سے اطالوی نژاد خاتون کا کہا ہوا یہ فقرہ اہل پاکستان کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ پاکستان کو فتح کرنے کے لیے کسی باقاعدہ حملے کی ضرورت نہیں بلکہ ہماری ثقافتی یلغار نے ان کے قلوب واذہان کو مسخر کرلیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عقل وخرد سے کام لے کر ان تمام سازشوں کا قلع قطع کرنے کی کوشش کریں جس سے نژادِ نو متاثر ہو رہی ہے۔ اسی حوالے سے کتاب میں تیسرا مضمون ''ثقافت'' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے ثقافت کا ارتقائی جائزہ لے کر قرآنی، اسلامی، مغربی ومشرقی مثالوں سے اس کے خدوخال واضح کیے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک کلچر اس کل کا نام ہے۔ جس میں مذہب وعقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم ورواج، قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جس کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے وہ مزید زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح دورانِ خون ہماری زندگی کی علامت ہے اسی طرح کلچر معاشرے کے لیے دورانِ خون کا درجہ رکھتا ہے۔

درج بالا اقتباس ایک ایسے دانشور اور غم خوار قوم کا ہے جس کی ادب کے مختلف موضوعات خصوصاً اردو ادب کی تاریخ پر علمی و تنقیدی اور تحقیقی بصیرت مسلمہ ہے۔ ایک جہاں ان کے فکر وتدبر کا قابل ہے۔ جب اسی قبیل کے دوسرے دانشور بھی ثقافت خصوصاً قومی ثقافت کے بارے میں اپنی ثقہ رائے رکھتے ہوں تو اہل الرائے اور اصحاب الرائے کی باتوں کو وزن دیا جانا چاہیے، جس کی آج اہل وطن کو اشد ضرورت ہے کہ ان اصحاب کی متفقہ رائے کی روشنی میں ہم ایک متفقہ قومی کلچر وضع کرلیں اور اس پر سختی سے گامزن ہوں کہ زندہ قوموں کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

کتاب میں شامل آخری مضمون ''زبان اور تہذیب'' ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ جو بین الاقوامی اردو کانفرنس، منعقدہ اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۵ء میں پڑھا گیا اور رسالہ ''ارتقا'' جلد ۳۹، ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ اردو اور ہماری دیگر پاکستانی زبانیں جہد البقا کی جنگ میں جذباتی نعروں میں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ ہمارے بازاروں اور گھروں کے اندر پائی جانے والی اشیا کی روحانی زبان انگریزی ہو چکی ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی نظام نے ۱۹۵۹ء کے بعد

اسکول کے مرحلہ تک فارسی اور عربی زبانوں میں سے کسی ایک کی اختیاری تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے اردو کے ساتھ تمام پاکستانی زبانوں کو دیوار سے لگانے کا فیصلہ کر کے جس غلطی کا ارتکاب کیا ہے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

آج ہمارے ارباب بست وکشاد اردو میں تعلیم حاصل کرنے کو وقت کا ضیاع قرار دیتے ہیں۔ روشن خیالی کی انتہا پر چلتے ہوئے اسلامیات کو تعصب اور بغض وکینہ کا سبب گردانتے ہیں۔ جب کہ ہمارے آباؤ اجداد، ادبا وشعرا اور اہل درد دانشور طبقے کے نزدیک اردو زبان کا فروغ پاکستانِ کی ثقافتی شیرازہ بندی اور سیاسی استحکام کا مظہر ہے۔ اس کو فروغ دے کر پاکستانی کلچر کی شیرازہ بندی کے عمل کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک علاقائی زبانوں کا فروغ لازمی ہے کیوں کہ علاقائی زبانیں اور ثقافتیں قومی زبان اور ثقافت کو سہارا دیتی ہیں اس لیے کہ اردو زبان کی جڑیں ان میں پیوست ہیں۔

زیر بحث کتاب معنوی وصوری اعتبار سے متعدد خوبیوں اور افادیت کی حامل ہے۔ مرتب نے کتاب میں مضامین کے کڑے انتخاب کے لیے جن چیزوں سے اخذ واستفادہ کیا ہے، اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) اخبارات ۴ (۲) رسائل وجرائد ۲۷ (۳) کتابیں ۳۴

کتاب میں ۲۹ مصنفین کے مضامین شامل ہیں۔ ۱۲ مصنفین کے ایک ایک مضمون جب کہ ۱۷ مصنفین کے ایک سے زائد مضمون شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے چھ چھ مضامین موضوع کے تنوع اور افادیت کے لحاظ سے شامل کتاب ہیں۔ اسی طرح: ڈاکٹر محمد علی صدیقی ۵ مضامین، سراج منیر ۴ مضامین، سید محمد تقی، سلیم احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سید عبداللہ کے تین تین مضامین جب کہ ممتاز حسین، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، شمیم احمد، جیلانی کامران، انتظار حسین، محمد ہادی حسین، پروفیسر کرار حسین، نظیر صدیقی کے دو دو مضامین شامل کتاب ہیں۔ آخر میں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اشتیاق احمد ابھرتے ہوئے محنتی ادیب اور نقاد ہیں جو تنقیدی حوالے سے اپنی ایک پہچان بنا رہے ہیں۔

ہرن کنڈ اور دوسری کہانیاں

قیصر سلیم

صفحات: ۱۷۴، قیمت: ۲۰۰ روپے

میڈیا گرافکس، نارتھ کراچی، کراچی

مبصر: محمد احمد سبزواری

سوال یہ ہے کہ قیصر سلیم کو ناول نگار کہا جائے یا افسانہ نگار، مضمون نگار یا مترجم کہ موصوف ان چاروں شعبوں پر اپنے قدم جما چکے ہیں۔ ان کے آٹھ ناول، تین سفرنامے، چار ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔ اس وقت ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''ہرن کنڈ اور دوسری کہانیاں'' میرے پیش نظر ہے۔ سب سے پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے وہ ان کا اختصار ہے، جس کا اندازہ یوں ہو

سکتا ہے کہ ۱۷۴ مضمون میں انھوں نے ۳۴ کہانیاں بیان کردی ہیں، یہ مختصر الفاظ میں اپنا مطلب بہت آسانی سے ادا کرنے پر مہارت رکھتے ہیں آج کی معروف دنیا میں چھوٹے چھوٹے افسانے ہی زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات خیالی، افسانوی یا تصوراتی نہیں یہ تو ان انسانی مسائل کو چن لیتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں بہت عام ہیں اور ان کے افسانوں یا کہانیوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو شاید ہمارا ہی مسئلہ ہے مثلاً بعض گھروں کے بچے آپس میں اس قدر دست و گریباں ہوتے ہیں کہ زندگی عذاب ہو جاتی ہے مگر کوئی ایک حادثہ سب کو یکجا کر دیتا ہے۔ اللہ کا کرم اسی کی عکاسی کرتا ہے، بوڑھے ساس، سُسر زندگی کی آخری منازل میں خصوصاً جب ان میں کا ایک رفیق اللہ کو پیارا ہو چکا ہو، بیٹوں کی بے اعتنائی اور بہوؤں کے سلوک سے تنگ آ کر موت کی دعا مانگنے پر ہی مجبور ہو جاتے ہیں، بوڑھا سردمے کا مریض ہے، پوتی کی منگنی کے لیے سسرال والے آ رہے ہیں، بہو فرماتی ہیں، ''بابا آج آپ کو دمے کی تکلیف زیادہ ہے، مہمانوں کے سامنے جائیں گے تو کھانستے رہیں گے، اس لیے آج آپ مہمانوں کے جانے تک باہر رہیے وہ رات بارہ بجے تک سردی میں سکڑتے رہے، بیٹے کا دوست ان کو گھر لے گیا، گرم دودھ وغیرہ پلایا مگر وہ ''بہو کیا مہمان چلے گئے؟؟ بار بار کہتے کہتے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بیٹا باپ کے مرنے کے بعد کناڈا چلا گیا، ماں کو اپنی بیوی کے سپرد کر گیا، بہو نے کچھ دن بعد ہی اوپر کے حصے میں کمرے بنوا کر ساس کو وہاں منتقل کر دیا اور خدمت کے لیے ملازمہ رکھ دی۔ ''خدمت، عزت محبت'' میں یہ سلوک تو بہو نے ساس سے کیا، ہم تو اسی سال کے بزرگ کو ایسبیس ٹاس Asbestos کی چھت ڈال کر چوتھی منزل پر منتقل کر کے ساری ذمے داریوں پر قبضہ کر لینے کا واقعہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق یا عبرت آمیز پہلو نظر آتا ہے۔

مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ

عشرت رومانی

صفحات: ۶۷۸، قیمت: ۶۰۰ روپے

نقش پبلی کیشنز، ۵۰۵، رفیق پلازہ، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مبصر: جمال نقوی

شاعر اور محاسبہ نگار عشرت رومانی نے، جب سے روزگارِ زندگی سے اجازت لے کر روزگارِ ادب کو اپنا پیشہ بنایا ہے، اس وقت سے انھوں نے تجزیہ نگاری اور تحقیق کے شعبے میں بڑے اہم کام کیے ہیں۔ شعورِ عصر میں پچاس تخلیق کاروں کی شاعری کا تجزیہ اور چند ہم عصر افسانہ نگار میں تیس افسانہ نگاروں کی تصنیفات کا تجزیہ اس بات کا غماز ہے کہ انھوں نے اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا ہے، اس کی قدر جانی ہے اور جو کچھ حاصل کیا ہے اس کا ابلاغ کیا ہے یعنی چراغ سے چراغ جلائے ہیں۔

ابھی ہم ان کی اس سحر کاری میں کھوئے ہوئے تھے کہ تقریباً پونے سات سو صفحات پر مشتمل ان کا ایک تحقیقی کارنامہ بھی منظر عام پر آ گیا۔ تبصرہ کا حق ادا کرنے اور قارئینِ ادب کے ذوقِ مطالعہ کے پیشِ نظر اپنی اجمالی رائے اور کتاب کے مندرجات کا ذکر کرنا

ضروری سمجھتے ہیں۔ حرف آغاز میں انھوں نے وجہ تحقیق بتاتے ہوئے معروف شاعر، طویل نظموں کے خالق، قومی تاریخ کے تجزیہ نگار اور کمیٹڈ تخلیق کار فضا اعظمی کی طویل نظموں کرسی نامۂ پاکستان، مرثیہ مرگ، ضمیر، عذابِ ہمسائیگی، آوازِ شکستگی اور خاک میں صورتیں کے مطالعہ کو ہی چراغِ راہ قرار دیا ہے۔ اصناف سخن کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے شاعری میں نئے تجربات کی طرف بھی نشان دہی کی ہے۔ شاعری میں مقصدیت کی طویل گفتگو شہر آشوب، نظموں اور غزلوں کے بہت سے اہم اور غیر اہم شعرا سے ہوتے ہوئے ان کے ممدوح فضا اعظمی تک پہنچتی ہے، جن کی غزلوں اور خصوصاً طویل نظموں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، مبصرین اور ناقدین کی آرا سے اقتباسات دیے گئے ہیں اور ان سے کیے گئے مطبوعہ مصاحبوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کے حصہ دوم و سوم کے علاوہ حصہ اوّل بھی کلام فضا اعظمی کے تجزیے پر پھیلا ہوا ہے اور بہت سے اہم تخلیق کاروں کے بارے میں گفتگو نہیں ہو سکی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب کا نام ہی 'فضا اعظمی کی مقصدی شاعری' ہونا چاہیے تھا۔ میری ناچیز رائے کے مطابق پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے باب میں اردو کے اہم شعرا کا چند سطروں میں بیان اور مختلف ممالک کی شاعری میں صرف دوسروں کے کیے گئے تراجم اور تبصروں سے اقتباس نیز دسویں باب میں 'معاشرہ اور آفاقی قدریں' سے صرف کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے، ورنہ ان ابواب کے ساتھ ہمارے نزدیک مصنف نے انصاف نہیں کیا ہے۔

بہر حال مجموعی اعتبار سے یہ عشرت رومانی کا ایک بڑا کام ہے۔ گو کہ مقصدی شاعری کی ابتدا تیرہویں صدی میں صوفیا کے کلام سے شروع ہو گئی تھی جس کو انیس و دبیر کے رثائی کلام سے فروغ ملا مگر مقصدی شاعری اپنی الگ پہچان نہ بنا سکی جس کی طرف عشرت رومانی نے بجا طور پر متوجہ کیا ہے۔ یہ ایک مستحسن اقدام ہے اور اس کام کو بڑے انہماک اور توازن کے ساتھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔

زوال سے پہلے (ناول)

شمیم منظر

صفحات: ۱۹۲، قیمت: ۲۰۰ روپے

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

مبصر: رؤف نیازی

عدمیت (Nihilism) نفی سے اثبات تک وجود انسانی کی آزادی کی پیش رفت کا فلسفہ ہے۔ موجود، متعین اور مرکوز کا استرداد (Negation) متبادلات (Substitutions) پر منتج ہوتا ہے۔ مارکسیت نے رومانیت کو بے دخل کیا، وجودیت نے مارکسیت کو، ساختیات نے وجودیت کو اور پس ساختیات نے ساختیات کو بیسویں صدی کے فکری منظر نامہ پر Marxism اور Existentialism نمایاں ترین افکار ہیں۔ شمیم منظر کا ناول ''زوال سے پہلے'' ان دونوں نظریات کو اپنا ہدف تحریر بناتا ہے۔ مرکزی کردار ہسپتال کے ایک کمرے میں (یہ کمرہ قید حیات یعنی دنیا کا استعارہ بھی ہے) عالم نزع سے گزر رہا ہے۔ اس کی گاہے بگاہے کھلتی اور بند ہوتی آنکھیں

اپنے ماضی کا جائزہ لیتی ہیں اور حال کے کرب کی اذیت کو محسوس کرتی ہیں۔ ہر باب کا سرنامہ زندگی کی یاسیت کا مظہر ہے۔ ان کہی وجودیت کی تشکیک اور تشویش کا اور یہی کردار Flash Back میں مارکسی نقطۂ نظر کے لیے اس قدر سنجیدہ اور فعال ہے کہ Activist کی اصطلاح اس پر پوری اُترتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے پس منظر میں شروع ہونے والا ناول اور اس کے کردار جرمنی اور غیر ملکی کرداروں تک جا پہنچتے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے نظریہ پرست اور مادیت پرست افراد سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ڈاکٹریٹ کے حصول کے لیے جانے والا مرکزی کردار اپنے خانگی معاشی حالات کی خرابی اور والدین کی خواہش کے احترام میں اپنی بہنوں کے جہیز کے حصول کے لیے اپنی ڈاکٹریٹ چھوڑ کر ملازمتیں کرتا ہے اور اپنی تہذیب کی اس روایت کو نبھاتا ہے جس میں بیٹی اور بہن بھی دو اور چیز بھی، ساتھی سنگی ایک ایک کر کے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر نظریاتی وابستگی کو ترک کر دیتے ہیں اور وہ خود زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے سب خواب بکھر جاتے ہیں۔ محبت، سماجی مرتبہ، تعلیم، صحت۔ وہ دیوار برلن کو گرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ روس کا شیرازہ بکھرتے ہوئے دیکھتا ہے، کھوکھلے نعروں اور خلاف فطرت معیشتی نظام کے نفاذ کی آمرانہ کوششوں کو دم توڑتا دیکھ کر اس کا مارکسزم پر یقین متزلزل ہو جاتا ہے اور مارکسزم کے استخراجی (A Priori) نقطۂ نظر کا استرداد اسے وجودیت کے استقرائی (A Posteriori) نظام میں داخل کر دیتا ہے جہاں زندگی کی یاسیت، تشویش، تشکیک، بے معنویت، مہملیت، بے اعتنائی اس کے شعور اور منطق کی نفی کر کے اسے ماورائے عقل (Transcendental) منطقہ تک لے جاتی ہے۔ اس کے کرب اور اضطراب کی گہرائی، شدت اور نوعیت کو کوئی پیمانہ ماپنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کا یقینی امکان اسے آن دبوچتا ہے۔ جی ہاں موت۔ ''زوال سے پہلے'' شمیم منظر کی ایک ایسی تخلیقی کاوش ہے جو بیسویں صدی کے دو انتہائی اہم اور معروف فلسفہ ہائے حیات کو اپنی گرفت میں لانے کی کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس کی دو علاحدہ فکری جہات اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہیں کہ انسان اپنے داخل اور خارج دونوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے اور یہ تشکیلیت سارتر کے نقطۂ نظر سے کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ Becoming میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ تخلیق کار نے کارل جیسپر کے اس خیال کی بھی تائید کی ہے کہ ''وجود محض'' اپنی منطقی تفہیم سے وجود کو ممکن بناتا ہے۔ اس کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے اور جہاں یہ عمل رکتا ہے وہیں عقیدہ در آتا ہے۔ سوچنے والے اذہان کا دھیان اس طرف بھی جاتا ہے کہ اگر تکمیلیت کا حصول ناممکن ہے تو پھر یہ تمام تگ و دو کس لیے؟ نظریات اور افکار مرتے ہیں صرف ان میں ترمیم تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ وقت کی گرفت ان کی رفتار تیز یا کم کر دیتی ہے۔ مارکسزم کا توسیعی وژن New Historicism کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ شمیم منظر نے ''سرنامہ'' اور ''تہ نامہ'' کی تکنیک اپنا کر ایک تخلیقی تجربہ بھی کیا ہے جو لائق توجہ ہے۔ مارکسیت، وجودیت اور مذہب جیسے پھیلے ہوئے موضوعات کو جس ہنرمندی سے مختصر ترین الفاظ میں سمیٹا ہے وہ اپنی جگہ لیکن ادب میں ناول کا کینوس اس سے دس گنا زیادہ بار اٹھا سکتا تھا۔ کہیں کہیں تشنگی کا احساس بہرحال رہتا ہے۔

جرأتِ رندانہ

آمنہ مفتی

صفحات: ۲۲۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

قوسین، ۱۵ سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور

مبصر: سلیم سہیل

اول جلول ناول لکھنا آسان ہے لیکن ڈھنگ کا ناول تحریر کرنا خاصا مشکل ہے۔ آمنہ مفتی ادب کے میدان میں نووارد ہیں لیکن وہ اپنے پہلے ہی ناول ''جرأتِ رندانہ'' میں جتنی پراعتماد نظر آتی ہیں وہ خاصا حیران کن ہے۔ اسی اعتماد کی وجہ سے ناول کی خوبیاں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور خامیاں، جو بہرحال ہیں اگرچہ زیادہ نہیں، نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

ناول میں مناظر ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ واقعات نہ پوری طرح شہر میں پیش آتے ہیں نہ دیہات میں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شہروں اور دیہاتوں میں جو سماجی رشتہ پایا جاتا ہے اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ منیر، جس کی ایک ٹانگ پولیو زدہ ہے، ایک متمول زمیندار کا بیٹا ہے۔ ناول کا آغاز منیر کے والد کے انتقال سے ہوتا ہے۔ منیر کو لاہور میں کالج چھوڑ کر گاؤں آنا پڑتا ہے تاکہ اپنی نئی ذمے داریوں سے عہدہ برا ہو سکے۔ منیر کی حسین و جمیل اور لائق فائق بہن شہلا شہر میں پڑھ رہی ہے۔ شہلا کی کالج کی سہیلیوں کی کھوکھلی زندگی کی تصویر خوب کھینچی گئی ہے۔ منیر اور شہلا دونوں یہ انتخاب کر سکتے ہیں کہ پاکستان چھوڑ کر کسی مغربی ملک میں جا بسیں لیکن بعض شعوری اور لاشعوری محرکات کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے اور اسی زمین سے وابستہ رہتے ہیں جو ان کی امانت بھی ہے اور امین بھی۔

منیر اور شہلا تو خیر مرکزی کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جو ثانوی کردار ہیں ان کی تصویر کشی بھی جان دار ہے۔ کون ہے جو اس خاندان کے حریف چوہدری منور علی، منیر کے حریف زمیندار، شمیم ذوالفقار، ادھیڑ عمر کے نامور آرٹسٹ شمیم ذوالفقار، صدف، عظمانہ اور عظمانہ کے چالاک، مطلب پرست بھائی، مانی، کو بھلا سکے؟ سب سے عمدہ پورٹریٹ چوہدری منور علی کی بیوی رابعہ کا ہے۔ ایک قدرے کم عقل، بے حد چٹوری اور سادہ دل عورت کے خیالات اور عادات کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے اس کی بدولت کردار میں جان پڑ گئی ہے اور اس بنا پر کہ وہ اپنی فطرت سے ہر وقت اتنی قریب ہے تنقید سے ماورا معلوم ہوتی ہے۔ نہ اس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے نہ نفرت۔ وہ کلی طور پر موجود ہے وہ بڑی خوش دلی سے چودھری منور علی کو نوجوان شہلا سے شادی کرنے کی اجازت دے دیتی ہے اور بڑی طمطراق سے برات لے کر آتی ہے!

بہت سے مصنف افسانے یا ناول کو خاطر خواہ طور پر ختم نہیں کر سکتے۔ آمنہ مفتی نے صرف پانچ سیدھی سادی سطروں میں ناول کو جس طرح اختتام کو پہنچایا ہے وہ قابلِ تحسین ناول کے اختتام سے ذرا پہلے ایک کردار خودکلامی کے انداز میں کہتا ہے: ''ہمارے دلوں میں کیا ہے؟ ہم خود کیا کرنا چاہتے ہیں، اس کا فیصلہ ہم میں سے کوئی نہ کر سکا۔'' یہی زندگی کا المیہ ہے کہ اپنے بھلے برے کو آسانی سے پہچان نہیں سکتے۔ آمنہ مفتی کا ناول اسی نقطۂ نظر کی تفسیر ہے۔

جمیل عظیم آبادی شخصیت اور فن

مرتبین: یاور امان معاون ابن عظیم فاتحی

صفحات: ۳۹۲، قیمت: ۴۰۰ روپے

میڈیا گرافکس ۹۹۷/۱۱۔اے، نارتھ کراچی

مبصر: کیفی حسینی

کتاب کے نام بعد وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اعترافِ ہنر اچھی بات ہے۔ جمیل عظیم آبادی خوش نصیب ہیں کہ انھیں دو مرتبین مل گئے ورنہ کتنے ہی گم نام اہل قلم ہیں جو اپنی عمر بھر کی محنت کا صلہ ناپنے کی آرزو لیے اس دنیا سے گزر گئے۔

کراچی کے بہت سے نامور اہل قلم نے جمیل صاحب کے فن کو سراہا ہے۔ اور انھیں ان کی اردو دوستی، محبِ وطنی پر دل کھول کر داد دی ہے۔

جمیل عظیم آبادی کا تعلق برصغیر کے اس خطے سے ہے جسے عرف عام میں ''بہار'' کہا جاتا ہے سرزمینِ ''بہار'' نے اردو زبان و ادب کے علاوہ علوم دینی میں بھی ایسے ایسے بے مثال اہل قلم عطا کیے ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر اردو ادب تشنہ رہ جاتا ہے۔

شاد عظیم آبادی، حضرت سید سلیمان ندویؒ علی میاں، عبدالغفور نساخ، وحشت کلکتوی وغیرہ۔ کہاں تک ان مشاہیر علم و ادب کا تذکرہ کیا جائے کہ جنھیں ''بہار'' نے اردو زبان و ادب کو دیے ہیں۔ انہی مشاہیر علم و ادب کے سلسلے کی کڑی جمیل عظیم آبادی ہیں۔ جنھوں نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کراچی کو رونق بخشی۔

اور یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ نہایت مستقل مزاجی سے اگر علم و ادب کا کوئی سلسلہ ۲۲/۲۴ سال سے مسلسل جاری و ساری ہے تو وہ جمیل صاحب کا قائم کیا ہوا نعتیہ سلسلہ ''مجلس احباب ملت'' کے ذریعے ۱۹۸۰ء سے اب تک جاری و ساری ہے۔

قابلِ تعریف امر یہ ہے کہ رنگ تغزل ہو کہ دوہا نگاری، حمد و نعت ہو کہ آزاد نظم و پابند نظم ادب کی کونسی صنف ہے جس پر جمیل عظیم آبادی نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ معراج حسن عامر تحریر کرتے ہیں: ''حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے درمیان شہر کراچی اور اندرون سندھ کے کچھ ایسے شعرا موجود ہیں جو شہرت اور مقبولیت کی پروا کیے بغیر ایک عرصے لکھ رہے ہیں، ان میں تو بعض بالکل گمنامی کے اندھیرے میں گم ہیں اور بعض اندھیرے اور اجالوں کے درمیان اپنے تخلیق کے عکس کو سورج کی پوشاک میں دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایسے ہی چند تخلیق کاروں میں جمیل عظیم آبادی کا نام نامی اسم گرامی بھی شامل ہے۔''

تزئینِ جہاں خالقِ فطرت نے تو کی ہے
شامل ہے مگر اس میں مرا ذوق ہنر بھی

(ہنر)

گردوپیش

ملک بھر میں اردو کے نفاذ کے لیے تحریک چلانا ہوگی — جمیل الدین عالی

ممتاز ادیب و شاعر ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ اردو کے عملی طور پر نفاذ کے لیے تحریک چلانی ہوگی اور بیوروکریسی کو نفاذ اردو سے متعلق اپنی سوچ تبدیل کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اگر تحریک بھرپور طریقے سے چلائی گئی تو نوجوانوں کی بڑی تعداد اس میں شریک ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنی رہائش گاہ پر تحریک نفاذ اردو کے وفد جس کی قیادت سرپرست تحریک ڈاکٹر سید مبین اختر کر رہے تھے سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ وفد میں تحریک کے رہنما سید صلاح الدین، ڈاکٹر نظر کامرانی، اشرف علی، زین صدیقی اور محمد فیاض شامل تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید مبین اختر نے ڈاکٹر جمیل الدین عالی کو تحریک کی جانب سے ملک میں نفاذ اردو کے لیے سندھ ہائی کورٹ میں دائر درخواست اور اردو کے نفاذ سے متعلق کی جانے والی جدوجہد سے متعلق تفصیلات سے آگاہ کیا جسے عالی جی نے سراہتے ہوئے کہا کہ اردو کے نفاذ کے سلسلے میں اب نئی حکومت سے بات چیت ہوگی اگر حکومت چاہے تو ملک میں اردو نافذ ہو سکتی ہے، ملک میں اردو سے لگاؤ کم نہیں ہوا، طورخم میں اتنی اردو پہلے نہیں بولی جاتی تھی جتنی آج استعمال کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا متبادل نہیں ہے اس لیے ان کے متبادل تلاش کرنے کے لیے مشکل میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید مبین اختر نے کہا کہ آئین پاکستان میں واضح طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ اردو قومی زبان ہے اور اسے ۱۵ سال میں رائج کرنے کے اقدامات کیے جائیں گے لیکن ۳۰ سال سے زائد عرصہ گزر گیا اردو کو نافذ کیا گیا اور نہ ہی مادری زبانوں کو ان کا حق دیا گیا ہے۔ دوسری جانب نئی نسل انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے شدید احساس محرومی کا شکار ہے حالاں کہ دنیا کے تمام ممالک نے اپنی زبان رائج کر کے ترقی کی ہے۔ فرانس، ہالینڈ، اسپین اور جرمنی کسی ملک نے انگریزی کو رائج نہیں کیا جب کہ وہ برطانیہ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے نفاذ کے لیے جدوجہد تیز کرنا ہوگی۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

احفاظ الرحمٰن کی چار کتابوں کی تقریب رونمائی

ممتاز شاعر اور دانشور ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ پاکستان سے طبقاتی تفریق ختم کرنے کی ضرورت ہے، ٹی وی چینلز پر بڑی بڑی باتیں کی جاتی ہیں لیکن اس اہم مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے آرٹس کونسل کے زیر اہتمام ممتاز ادیب اور صحافی احفاظ الرحمٰن کی چار کتابوں نئی الف لیلہ (شعری مجموعہ) جنگ جاری رہے گی (مضامین) تاریخ چین اور چواین لائی (سوانح حیات) کی تقریب رونمائی کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کتابیں اتنی خوب صورت تحریروں پر مشتمل ہیں کہ میرا بس چلے تو میں ان کو خرید کر لوگوں میں تقسیم کروں، بلاشبہ یہ کتابیں پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تقریب میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ آج کسی ادبی تقریب میں پہلی بار اتنی کھلی کھلی سیاسی

باتیں سن رہا ہوں۔ اس لیے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن امریکا ہے۔ انیسویں صدی سے پہلے امریکا بہت اچھا تھا، امریکا کے بڑے بڑے کارنامے ہیں، امریکی معاشرے کو قدر کی نگاہ سے دنیا میں دیکھا جاتا تھا مگر اب نہ جانے امریکا کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کے دماغ میں صرف سرمایہ داری کا بھوت سوار ہے۔ ممتاز نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کہا کہ احفاظ الرحمٰن کی شاعری میں مزاحمتی انداز نمایاں ہے۔ ان کی نظموں میں محاوروں کا کم سے کم استعمال ہے۔ انھوں نے روایتی سانچوں کو توڑا ہے۔ ان کی احتجاجی شاعری حبیب جالب اور خالد علیگ سے مختلف ہے۔ ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ احفاظ الرحمٰن ایک کمٹیڈ قلم کار ہیں، ان کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے، انھوں نے کبھی سودے بازی نہیں کی وہ، وہ تجزیاتی ذہن رکھنے والے قلم کار ہیں۔ انھوں نے اپنی چاروں کتابوں میں اپنی زندگی کے تجربوں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے چین کے لوگوں کو بھی اپنے کردار سے متاثر کیا۔ ممتاز کالم نگار زاہدہ حنا نے کہا کہ احفاظ الرحمٰن انقلابی ذہن رکھتے ہیں، غاصبوں کے خلاف ان کا غصہ کبھی کم نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کتاب ''جنگ جاری رہے گی'' نئی نسل کو ہتھیاروں کی تجارت کے خلاف ایک آواز ہے، جو اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ آرٹس کونسل کے اعزازی جنرل سیکرٹری محمد احمد شاہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ تقریب سے صاحب اعزاز احفاظ الرحمٰن، خالد چودھری، حسن ظہیر اور فاضل جمیلی نے بھی خطاب کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

جوش کی رباعیات کے انگریزی ترجمے پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور دیگر کا خطاب

ممتاز نقاد اور دانشور ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کہا ہے کہ ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے اس کے لیے دونوں زبانوں پر مکمل عبور ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان (سندھ) کی جانب سے جوش ملیح آبادی کی رباعیات پر مشتمل کتاب ''قطرہ و قلزم'' کے انگریزی ترجمے پر مشتمل محمد یامین کی کتاب "A Drop and Ocean" کی تعارفی تقریب کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد یامین نے جوش ملیح آبادی ی رباعیات کو انگریزی میں منتقل کر کے مشرقی شاعرانہ روایات سے اہل مغرب کو روشناس کرایا ہے۔ جوش کی رباعیات کا کینوس بہت وسیع ہے جو فکری و فنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ترجمہ صاف اور سادہ ہے جس میں رباعی کے تین مصرعوں میں ردیف کی پابندی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جو انگریزی زبان میں ایک مشکل کام تھا۔ ممتاز طنز و مزاح نگار ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے کہا کہ محمد یامین نے جوش ملیح آبادی کی رباعیات کا ترجمہ اصل روح کے مطابق کیا ہے جو ایک مشکل کام ہے۔ انھوں نے حافظ و خیام کے بعد جوش ملیح آبادی کا تعارف رباعیات کے ترجمے کے ذریعے کرایا ہے جو بیسویں صدی کے اس حافظ و خیام کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ معروف شاعر عشرت رومانی نے کہا کہ محمد یامین نے جوش ملیح آبادی کی رباعیات کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ان کی شاعرانہ سوچ اور فکر کو اہل مغرب تک پہنچا کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ قبل ازیں اکادمی ادبیات پاکستان (سندھ) کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کتاب پر نذیر احمد چنا اور محمد یامین نے بھی خطاب کیا۔ منظوم اظہار خیال کرنے والوں میں تشنہ بریلوی، عبدالجبار اثر، حیدر بخش ہکڑو، راشد کنڈی، سراج المنیر، تسنیم اور صالحہ کوثر شامل ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری پر آغا نور محمد پٹھان کا خطاب

اکادمی ادبیات پاکستان کے صوبائی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان نے کہا ہے کہ سندھ کے ادب و ثقافت پہر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت اور شاعری نے گہرے اور مثبت اثرات مرتب کیے ہیں، وہ یونی ورسٹی آف ایسٹ لطیف آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف کرنٹ افیئرز کے زیر اہتمام سیمینار سے خطاب کر رہے تھے۔ شاہ بھٹائی سے شیخ ایاز تک ''سندھی ادب و ثقافت'' کے عنوان سے سیمینار سے ادیب موسیٰ بھٹو، ذوالفقار علی، شاہد شیخ، راحیل قریشی، ڈاکٹر ھطالب زرداری اور اسلام خشک نے بھی خطاب کیا۔ مقررین نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ شاہ بھٹائی صرف سندھ کے شاعر نہیں کہلائے جاسکتے بلکہ ان کی شاعری اور پیغام کی مخاطب ساری انسانیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ بھٹائی کی شاعری درحقیقت اللہ تعالیٰ سے محبت اور انسانیت کی خدمت کا درس دیتی ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائی درحقیقت ایک درویش، صوفی، شاعر، فلسفی اور انسانیت سے محبت کرنے والے انسان تھے، ان کی زندگی سادگی اور وقار کا عملی نمونہ تھی اور وہ ایک باعزت، مہذب اور علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی فکر کو عام کرنے میں سندھ کے نامور دانشور، ادیب اور شاعر شیخ ایاز کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے جنھوں نے اپنے قلم سے شاہ بھٹائی کی شاعری کو نہ صرف عام لوگوں بالخصوص سندھی نہ سمجھنے والے افراد تک پہنچایا۔ بلکہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کے بنیادی پیغام اللہ تعالیٰ سے محبت اور انسانیت کی خدمت کو نمایاں کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

''محبتوں کے سائے'' کی تعارفی تقریب سے جاذب قریشی کا خطاب

ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر جاذب قریشی نے کہا ہے کہ نئے لکھنے والوں کی شاعری میں تازگی کا احساس نمایاں ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے بزم وسیم ادب (انٹرنیشنل) کے زیر اہتمام امریکا میں مقیم اردو کے معروف شاعر راشد رحیمی کے مجموعہ کلام ''محبتوں کے سائے'' کی تعارفی تقریب کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ راشد رحیمی کے اظہار میں خود ان کی وہ ذاتی صلاحیت اور ان کی وہ خاندانی تربیت بھی بول رہی ہے جو انھیں اپنے والدین اور گھر والوں سے ورثے میں ملی ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ راشد رحیمی محبتوں کو شدت سے محسوس کرنے والا نام ہے۔ انھوں نے کتاب کے ناشر سراج الدین سراج کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بے لوث ادبی کارکن ہیں، انھیں ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ، وہ دیوانہ وار ادب کی خدمت میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مہمان خصوصی اکادمی ادبیات پاکستان کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان نے کہا کہ راشد رحیمی کی پوری شاعری محبت جذبے سے عبارت ہے وہ امریکا میں رہتے ہیں لیکن ان کا دل پاکستانیوں کے لیے دھڑکتا ہے۔ مہمان اعزازی عقیل اشرف نے کہا کہ راشد رحیمی کی شاعری میں انسان رشتوں کا احترام نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب پر رخسانہ صبا، اختر سعیدی اور سلمان صدیقی نے بھی اظہار

خیال کیا۔ قبل ازیں میزبان الحاج محمد وسیم عمر نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ بعدازاں محفل مشاعرہ میں جن شعرا نے کلام سنایا ان میں پروفیسر جاذب قریشی، عقیل اشرف، فہیم ردولوی، رفیع الدین راز، عارف منصور، اختر سعیدی، سعید الظفر صدیقی، ڈاکٹر اقبال پیرزادہ، شارق بلیاوی، رخسانہ صبا، ساجد علی ساجد، اقبال خاور، سراج الدین سراج، سلمان صدیقی، فوقیہ مشتاق، رضی عظیم آبادی، حمیرا راحت، سحر علی، توقیر تقی، اختر عبدالرزاق، سعد الدین سعد، شکیل وحید، فیروز خسرو، عاطف مرزا، زہرا جنید زارا، احقہ الحیٰ وفا، آئیرن فرحت، شبیر نازش، م م مغل اور شاد احمد شامل ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

''موسم موسم ملتے تھے'' کی تقریب رونمائی

ممتاز دانشور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہا ہے کہ ہجر و وصال نا آسودگی، محبت، تعلق، انا اور انسانی رویے ظریف احسن کی شاعری کے کلیدی موضوعات ہیں۔ ظریف احسن کی رجائیت انھیں قنوطیت سے بچائے ہوئے ہے۔ یہ بات انھوں نے معروف شاعر ظریف احسن کے پہلے شعری مجموعہ ''موسم موسم ملتے تھے'' کی تقریب اجرا میں صدارتی خطبہ میں کہی جس کے مہمان خصوصی عبدالحسیب خان تھے۔ پیرزادہ قاسم نے کہا کہ ''موسم موسم ملتے تھے'' مزاجاً داخلیت پسند شاعر کا مجموعہ کلام ہے۔ مہمان خصوصی عبدالحسیب خان نے کہا کہ شعرا اور ادیبوں کی ذمے داریاں ہیں کہ وہ اپنی سماجی، معاشی اور ثقافتی اقدار کے فروغ کے لیے کام کریں اور یہ وقت کی بھی ضرورت ہے، ظریف احسن کا شعری اسلوب بہت بھرپور اور مختلف ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ شاعری عموماً ذات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ پھر ایک مرحلہ آتا ہے جب شاعر کو اپنی راہ متعین کرنا ہوتی ہے۔ ظریف احسن بھی اس مرحلے کے ہم رکاب ہیں۔ وہ زیر لب اداس لہجے میں شعر کہتے ہیں۔ شاعر خالد معین نے کہا کہ ظریف احسن ''موسم موسم ملتے تھے'' میں ایسے تخلیقی استعارے کو گرفت میں لانے کی کاوش کر رہے ہیں جس میں ان کی سادگی اور نمایاں تر ہے۔ تقریب سے سیف الرحمٰن گرامی، رضوان صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ صاحب کلام ظریف احسن نے اپنا کلام بھی پیش کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ایوانِ غالب دہلی میں ریسرچ اسکالرز سیمینار کا انعقاد

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے ریسرچ اسکالر سیمینار کے انعقاد پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ممبران کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ریسرچ اسکالر سیمینار میں موجود وقت کی اہم ضرورت ہے کیوں کہ عالمی سطح پر ہمارے سامنے جو مشکلات اور چیلنجز ہیں ان مشکلات اور چیلنجز کا سامنا یہ نوجوان نسل ہی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اپنی نوجوان نسل کی تربیت اس

منٹو کے لیے اکادمی ادبیات کراچی کی تقریب

سعادت حسن منٹو کو معاشی اور سماجی اعتبار سے ایک دہکتے ہوئے منطقے سے گزرنا پڑا۔ ان کا ذریعہ معاش اوڑھنا بچھونا لکھنا ہی تھا وہ قلم سے روزی کماتے رہے یہ بات ممتاز افسانہ نگار اسد محمد خان نے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام سعادت حسن منٹو کی یاد میں ہونے والے سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ مہمان خصوصی ممتاز افسانہ نگار احمد ہمیش نے کہا کہ منٹو اپنے قاری کو خواب آور گولیاں دے کر سلانا نہیں چاہتا بلکہ وہ سچائی دکھا کر انھیں جھنجھوڑنا چاہتا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار فردوس حیدر نے کہا کہ منٹو کا کام ان تخلیق کاروں میں سرفہرست ہے جس پر مصلحت اور منافقت کا رنگ نہیں چڑھا اس لیے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ معروف شاعرہ روبینہ تحسین بینا نے کہا کہ جب ایک ادیب حقیقتوں کو سانس لیتے ہوئے دیکھتا ہے تو افسانہ شعر یا اور کوئی تحریر تخلیق ہوتی ہے سعادت حسن منٹو نے معاشرتی حقائق کو اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے ان کا ہر کردار اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ پروین نظیر سومرو نے کہا کہ سعادت حسن منٹو اردو افسانے کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں انھوں نے جتنے رنگارنگ موضوعات پر کہانیاں لکھیں اور زندگی کے جتنے پہلوؤں کا احاطہ کیا وہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کا مشاہدہ بہت گہرائی میں جا کر پوری توجہ کے ساتھ کیا تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان نے کہا کہ سعادت حسن منٹو پاکستانی ادب کے معمار تھے اور اکادمی نے اپنے اکابرین کے کارناموں کو نئی نسل تک پہنچانے کا عہد کیا ہے۔ بلوچی زبان کے نامور افسانہ نگار محمد بیگ بیگل نے کہا کہ سعادت حسن منٹو اردو ادب کے عظیم قلم کار تھے جس نے برصغیر کے معاشرے کے باجبر روایت کی موجودگی میں بڑی جرأت سے قلم سے کام کیا جس کو آئندہ نسلوں تک یاد رکھا جائے گا۔

(رپورٹ: روزنامہ "جنگ" کراچی)

نیاز بدایونی انتقال کر گئے

ممتاز غزل گو شاعر نیاز بدایونی طویل علالت کے بعد ۷۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، مرحوم کو ملک پلانٹ قبرستان گلشن اقبال میں سپرد خاک کر دیا گیا، نماز جنازہ اور تدفین میں معروف شخصیات نے شرکت کی۔ نیاز بدایونی مرحوم کے ۲ شعری مجموعے ''درد کو کتاب کیا'' اور ''لہجہ میری تہذیب کا'' شائع ہو چکے ہیں۔ مرحوم نیاز بدایونی نے متعدد نصابی کتب بھی مرتب کیں۔ وہ محکمہ موسمیات سے اسسٹنٹ میٹرولوجسٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ مرحوم نیاز بدایونی کا سوئم اتوار ۲ مارچ کو ہوگا۔ سوئم کے سلسلے میں مرد حضرات کے لیے قرآن خوانی بعد نماز ظہر بغدادی مسجد مارٹن کوارٹرز میں ہوگی جب کہ خواتین کے لیے قرآن کا اہتمام مرحوم کی رہائش گاہ ایف ۱/۱۹۳، مارٹن کوارٹرز میں کیا گیا ہے۔ مرحوم نیاز بدایونی نظامی پریس بدایوں کے مالک اور ممتاز دانشور و صحافی امید الدین نظامی کے داماد تھے۔ انھوں نے پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

انداز میں کریں کہ وہ ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف آواز اٹھا سکیں اور اپنی تحریروں سے امن و بھائی چارے کا پیغام سماج کو دے سکیں۔
اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں تمام اسکالرز کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ریسرچ اسکالر سیمینار کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ملک اور بیرون ملک کے اسکالرز سے روبرو ہوتے ہیں، تبادلہ خیال کرتے ہیں اور ہمیں ان کے مقالات سے تحقیق وتنقید کی سمت و رفتار کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس طرح کے سیمینار کے انعقاد کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ اپنے اساتذہ کے سامنے خیالات کا اظہار کا کریں تا کہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو، اور وہ اپنے نظریات کو بلا جھجک پیش کر سکیں۔ اس سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے مشہور و معروف ادیب و دانشور پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ وقت میں ہم نوجوان نسل کے سامنے تحقیق کی افادیت پر روشنی ڈالیں کیوں کہ اصل تحقیق اس وقت ممکن ہے جب ہم کوئی نئی چیز کو اجاگر کریں ور چھپے ہوئے نکتے کی بازیافت کریں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس سیمینار سے ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ تحقیق کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب شاہد ماہلی نے ریسرچ اسکالرز سیمینار کے حوالے سے فرمایا کہ یہ سیمینار ہمارے تمام سیمیناروں کے مقابلے میں روز بروز مقبولیت کے منازل طے کر رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے تمام سیمیناروں میں ریسرچ اسکالرز سیمینار کی ایک خاص اہمیت ہے۔

(بشکریہ: ''کتاب نما''، دہلی، اکتوبر ۲۰۰۷)

علم کے مرحلے میں ترجمے کے مقام پر ڈاکٹر خلیق انجم کی تقریر

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سیکریٹری اور ممتاز دانشور ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ حصول علم کے مرحلے میں ترجمے کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ کسی بھی ایک زبان میں اتنا علمی مواد موجود نہیں ہے جو علم کے بحر بیکراں کو سمیٹنے کے لیے کافی ہو۔ وسعت علمی کے لیے ہمیں لامحالہ دیگر زبانوں میں موجود مواد کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ترجمہ ہی واحد راستہ ہے جو اس مواد تک ہماری رسائی کو یقینی بناتا ہے۔
ڈاکٹر خلیق انجم نے ان خیالات کا اظہار یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی میں منعقد یوم اساتذہ لکچر کے دوران کیا جس کا موضوع ''اردو ذریعہ تعلیم میں ترجمے کی اہمیت'' تھا۔ فن ترجمہ نگاری نامی معروف کتاب کے مرتب ڈاکٹر انجم نے اردو یونی ورسٹی میں شعبۂ ترجمہ کے قیام اور وہاں سے ایم اے ترجمہ کورس شروع کیے جانے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس میدان میں روزگار کے بے پناہ مواقع ہیں اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان مواقع میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے ترجمے کے لیے لغات کو اپنا مستقل ساتھی بنانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو کسی لفظ کے معنی معلوم بھی ہوں تو بھی لغت دیکھنی چاہیے تا کہ اس کے مختلف متبادل و مترادف الفاظ بیک وقت سامنے آجائیں اور آپ ان میں سے بہتر کا انتخاب کر سکیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تخلیقی ادب بطور خاص فکشن کے لفظی ترجمے کی مخالفت کی اور منشائے مصنف کی پیش کشی کو مرجح طریقہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ البتہ دونوں زبانوں سے وابستہ تہذیب و تمدن،

لسانی مزاج اور مخصوص تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اردو کے فروغ و ترویج میں دکن کے رول کی تعریف کی اور کہا کہ ماضی میں بھی یہاں اردو کی ترقی کے لیے سرکاری و نجی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور آج بھی یہاں اس کے لیے پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ موافق ماحول موجود ہے۔ انھوں نے اردو یونی ورسٹی کے حوالے سے کہا کہ اس ادارے نے پورے ہندوستان کے تعلیمی ماحول کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کا صدر دفتر گرچہ حیدرآباد میں ہے لیکن اس کے اثرات پورے ہندوستان پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اس کی خبروں سے اردو اساتذہ اور عام اردو والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر انجم کے ہاتھوں نظامت فاصلاتی تعلیم کی عمارت میں پانچ سو نشست والے آڈیٹوریم کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔

(بشکریہ: ''کتاب نما''، دہلی، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

صابر ظفر کا نیا شعری مجموعہ شائع ہو گیا

ممتاز غزل گو صابر ظفر کا تازہ ترین شعری مجموعہ ''ہر چیز کلام کر رہی ہے'' کے عنوان سے شائع ہو گیا ہے جس میں انھوں نے خصوصی طور پر اپنے گردوپیش موجود رہنے والی بے جان اشیا کو بھی کلام کرتے ہوئے دکھانے کا ایک نیا تخلیقی تجربہ کیا ہے جو اردو غزل کی معلومہ تاریخ کے تناظر میں اپنی نوعیت کا منفرد اور جداگانہ تجربہ ہے۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ناول ''زوال سے پہلے'' اور لہو کی موجیں'' شائع ہو گئے

معروف ادیب شمیم منظر کا ناول ''زوال سے پہلے'' شائع ہو گیا ہے۔ ناول ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، علاوہ ازیں واقعہ کربلا کے موضوع پر معروف قلم کار محمد علی سید کے ناول ''لہو کی موجیں'' کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے، اس کتاب پر علامہ طالب جوہری کا ایک تفصیلی مضمون شامل ہے، جب کہ دیباچہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے اور پیش لفظ پروفیسر سردار نقوی نے تحریر کیا ہے۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعزاز میں ''ادراک'' کی تقریب

پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کی شخصیت متعدد اور متنوع صفات کی حامل ہے۔ وہ اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں کے رمز شناس ادیب اور شاعر ہیں اور برجستہ اور شستہ انگریزی میں بھی تصنیف و تالیف پر قادر ہیں وہ دقیقہ رس اور نکتہ طرز نقاد ہیں، معاصر مسائل پر گہری نظر رکھنے والے عالم و فاضل ہیں اور بہت شگفتہ مزاج مجلسی انسان ہیں۔

حال ہی میں ڈاکٹر صاحب طہران یونی ورسٹی ایران میں تین سال تک پاکستان چیر پر علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات سرانجام دینے کے بعد لاہور واپس آئے ہیں اور پھر سے اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں حاضر ہو گئے ہیں۔ طہران یونی ورسٹی میں

انھوں نے گراں قدر اور قابل تقلید کام کیا ہے۔ اس یونی ورسٹی میں انھوں نے اردو کی تدریس کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی میں درجنوں معرکہ آرا علمی و ادبی مقالات بھی لکھے جو ایران اور پاکستان کے موقر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر تحسین اقبالیات کے ماہر ہیں چناں چہ انھوں نے گزشتہ تین برسوں میں اقبال کے فکر و فن کے بارے میں بھی کئی مضامین لکھے اور اس طرح ایران میں اقبال شناسی کی روشن روایت کو آگے بڑھایا۔ ۲۷ر فروری ۲۰۰۸ء کو ادبی ادارہ ''ادراک'' لاہور نے ڈاکٹر تحسین کے اعزاز میں ایک محفل استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت جناب شہزاد احمد نے کی۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی مہمانِ خصوصی تھے۔ ادارہ ''ادراک'' کے جنرل سیکرٹری قاری صادق جمیل صاحب نے قرآن پاک کی تلاوت سے محفل کا آغاز کیا۔ ادراک کے صدر جناب واحد امر نے اپنی نعت پیش کی۔ پروفیسر ڈاکٹر ضیا الحسن نے ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے بارے میں تمہیدی اور تعارفی کلمات کہے ڈاکٹر تحسین نے ایران میں اپنے زمانۂ قیام کا تفصیلی ذکر کیا اور وہاں اپنی کارگزاری اور مشاہدات و تجربات کی روداد سنائی۔ اپنی گفتگو میں ڈاکٹر تحسین نے موجودہ ایرانی ادبی اکابر کے افکار و خیالات پر بھی روشنی ڈالی اور پاکستان کے بارے میں ان کے تاثرات کا بھی اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ایران میں علمی و ادبی اور ثقافتی سطح پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری وزارت امورِ خارجہ کو چاہیے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنے سفیر اور نمائندے بھیجنے سے پہلے یہ دیکھ لیا کرے کہ وہ حضرات متعلقہ ملک کی زبان بھی جانتے ہیں یا نہیں، زبان شناسی کے حوالے سے دو ملکوں کے باہمی تعلقات اور باہمی خیر سگالی کے امور پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کے بغیر سفارت اور نمائندگی کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔

ایران میں اپنے مطالعات و مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین نے کئی دلچسپ واقعات بھی سنائے جن سے حاضرین بہت محظوظ اور مستفید ہوئے۔ مثلاً یہ کہ کسی ایرانی نے کسی ہندوستانی کو بندر عباس کا باشندہ سمجھا اور اس سے پوچھا، ''آغا بچۂ بندری؟'' ہندوستانی نے سمجھا کہ یہ مجھے بندروں کی اولاد کہہ رہا ہے۔ چناں چہ اس نے فوراً پلٹ کر کہا کہ ''تو خود ہوگا'' ڈاکٹر تحسین نے بتایا کہ ایرانی بول چال کی زبان اور ہماری پنجابی زبان میں درجنوں الفاظ اور اظہارات مشترک ہیں مثلاً وہاں لفظ مقراض کو آج کل عام لوگ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بجائے لفظ ''قینچی'' بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین نے سامعینِ کرام کی فرمائش پر اپنا تازہ کلام بھی سنایا۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر نذرِ قارئین ہیں:

چمن اتنا خزاں آثار پہلے کب ہوا تھا
بلا کا قحطِ برگ و بار پہلے کب ہوا تھا
میں جن گلیوں میں پیہم برسرِ گردش رہا ہوں
میں ان گلیوں میں اتنا خوار پہلے کب ہوا تھا

ڈاکٹر تحسین کے بارے میں اپنی نظم پیش کرنے سے پہلے ناچیز نے عرض کیا کہ پطرس بخاری کا یو این او کی ملازمت کے سلسلے میں امریکا چلے جانا پاکستان کے لیے تو انتہائی مبارک تھا لیکن اردو ادب اور لاہور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے کچھ نیک فال ثابت نہیں

ہوا تھا لیکن ڈاکٹر تحسین کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ ان کا ایران میں پاکستان چیر پر جانا بذاتِ خود ایک علمی و ادبی مصروفیت تھی تاہم اس سے لاہور کی علمی و ادبی فضا کو وقتی طور پر اپنی محرومی کا احساس ضرور تھا۔ امید ہے ان کے واپس آنے سے یہاں کا تعلیمی ادبی اور تہذیبی منظرنامہ مزید روشن ہوگا۔

ڈاکٹر خورشید رضوی نے ڈاکٹر تحسین کی متنوع اور حیات افروز صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لاہور میں ان کی واپسی کو نہایت خوش آئند قرار دیا۔ صاحبِ صدارت جناب شہزاد احمد نے بیک وقت پھیلتی اور سمٹتی ہوئی اس دنیا کے لیے تراجم وغیرہ کے ذریعے مختلف اور متنوع سائنسی، معاشرتی اور تہذیبی علوم کی بہم رسانی کو ناگزیر قرار دیا اور اس ضمن میں انھوں نے ڈاکٹر تحسین فراقی کی خدمات کا بھی اعتراف کیا۔

علم و ادب کی اس مجلسی چکاچوند میں کاغذ اور قلم سے تعلق رکھنے والی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ان حاضرینِ کرام میں سے پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک، پروفیسر ناصر عباس نیر، جناب حفیظ الرحمٰن احسن، پروفیسر سلیم منصور خالد، پروفیسر نصیر الدین ہمایوں، پروفیسر امجد طفیل، پروفیسر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر رفاقت علی شاہد، پروفیسر عبداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر محمد کامران، پروفیسر ناصر بشیر، جاوید قاسم، پروفیسر حسین احمد زبیر، فاطمہ غزل، زاہد علی خاں، نبیل احمد نبیل اور کامران ناشط کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

(رپورٹ: جعفر بلوچ، لاہور)

حلقۂ آہنگِ نو کے تحت اعزازی نشست

گزشتہ دنوں برطانیہ سے آئے ہوئے مہمان شعرا ناظر فاروقی، شاعرہ و مصورہ پروین شیر اور دانشور ڈاکٹر وارث شیر (امریکا) کے اعزاز میں حلقۂ آہنگ نو اور ''پیش رفت'' (انٹرنیشنل) کے تحت ایک خصوصی شعری نشست ترتیب دی گئی جس کی صدارت نورالہدیٰ سید نے کی۔ جب کہ ناظم نشست شفیق احمد شفیق نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ ہماری ادبی تنظیم کی یہ روایت ہے کہ جب بھی شہر ادب کراچی میں کسی معتبر شاعر و ادیب کی آمد ہو تو اس کے شایانِ شان ادبی نشست کا اہتمام کیا جائے اسی ادبی روایت کی پاس داری میں آج کی شام مہمانوں کے نام منسوب ہے کلام شاعر بزبان شاعر کی ابتدا سے قبل شعرا کا محفل کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مہمان شعرا نے کہا کہ مغربی ممالک میں آباد اردو کی نئی بستیوں میں ادبی سیمینار اور مشاعروں سے اردو زبان و ادب فروغ حاصل ہو رہا ہے جو بہر طور حوصلہ افزا ہے۔ صدر نشست نورالہدیٰ سید نے ناظر فاروقی کے شعری مجموعے ''ورق ورق گلاب'' اور شاعرہ و مصورہ پروین شیر کے خوب صورت تجریدی آرٹ پر مشتمل شعری مجموعہ ''کرچیاں'' کی تعریف کی۔

بعد ازاں مہمان شعرا و سامعین کو پرتکلف عشائیہ دیا گیا جن شعرا کرام نے اپنا تازہ کلام نذر سامعین کیا ان میں ناظر فاروقی، پروین شیر، عشرت رومانی، افتخار اجمل شاہین، شفیق احمد شفیق، جمال نقوی، احمد سعید فیض آبادی، حامد علی سید، مسعود عالم مسعود، صالحہ کوثر، محمد سراج المنیر کے نام شامل ہیں۔

(رپورٹ: احمد سعید فیض آبادی)

تنظیم ''اظہار'' کی ادبی تقریب سے پیرزادہ قاسم کا خطاب

شیخ الجامعہ کراچی، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہا ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہی نہیں آئینہ بھی ہے، ادبی اقدار کو زندہ رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے معروف ادبی و ثقافتی تنظیم ''اظہار'' کے زیر اہتمام ''پیرنٹس فورم'' کے تعاون سے کیپٹن جمیل احمد خان کی رہائش گاہ پر منعقدہ محفل مشاعرہ میں بحیثیت صدر اپنے خطاب میں کیا، جس کے مہمان خصوصی سابق گورنر سندھ لیفٹننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک یادگار محفل ہے جو بڑے بڑے مشاعروں پر بھاری ہے، شعرا کا انتخاب بھی قابل داد ہے اور باذوق سامعین کی تعداد بھی باعث رشک ہے۔ کیپٹن جمیل احمد خان نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہ کہ عموماً موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے، میں کہتا ہوں کہ شاعری بھی روح کی غذا ہے، انھوں نے کہا کہ بلاشبہ کراچی گہوارہ علم و ادب ہے، اس شہر نے ادب و ثقافت کی بے مثال خدمت کی ہے، انھوں نے کہا کہ میں معزز شعرائے کرام اور تمام مہمانانِ گرامی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس محفل میں شرکت کر کے مجھے عزت کا موقع فراہم کیا، نظامت کے فرائض، ممتاز شاعرہ، ذکیہ غزل نے انجام دیے۔ اس موقع پر جن شعرا نے کلام پیش کیا، ان میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، محمود شام، ماجد خلیل، غوث متھراوی، ذوالفقار سیال، راشد نور، ریحانہ روحی، اختر سعیدی، ذکیہ غزل، حیدر حسنین جلیسی، خالدہ عظمیٰ اجور انور علی رومی شامل ہیں۔ اس مشاعرے میں شہر کی جن شخصیات نے شرکت کی ان میں مشتاق احمد یوسفی، زیڈ اے نظامی، عبدالحسیب خان، علی عباسی بروہی، قاضی اسد عابد، نفیس احمد صدیقی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، میاں زاہد حسین، ڈاکٹر خالدہ غوث، ڈاکٹر ایس اے صدیقی، ڈاکٹر ظفر صدیقی، ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈاکٹر سلطان احمد، محمد علی شیخ، ڈاکٹر عالم آرا صدیقی، کبیر الدین، شاہینہ پوری، گلوکار جہاں زیب، کیپٹن صغیر احمد اور محمد وسیم قریشی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ایس ایم معین قریشی کی کتاب کی رونمائی

ممتاز دانشور پروفیسر سحر انصاری نے کہا ہے کہ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی شگفتہ نگاری میں اپنی انفرادیت کا سکہ جما چکے ہیں، ان کی نثری تحریروں میں مزاح کے ساتھ بہت کچھ ہوتا ہے، وہ اپنی شگفتہ تحریر کے ذریعے موزوں الفاظ قاری تک منتقل کرتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام مزاح نگار اور کالم نویس ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے مزاحیہ مضامین پر مبنی سولہویں کتاب ''خود خوش حملہ'' کی تقریب اجرا میں اپنے صدارتی خطبے میں کہی۔ جس کے مہمانِ خصوصی عبدالحسیب خان، مہمان اعزازی میاں زاہد ملک تھے۔ مقررین میں پروفیسر در شہوار قادری، عظیم سرور، رضوان صدیقی شامل تھے۔ ثاقب انجان نے منظوم اظہار خیال کیا۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہما میر نے انجام دیے۔ پروفیسر سحر انصاری نے مزید کہا کہ معین قریشی حسبِ منشا لکھتے ہیں اس لیے اردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود نہ خود تھکے اور نہ ان کے قاری کسی اکتاہٹ کا شکار ہوئے۔ ''خود خوش حملہ'' جو خودکش حملے کی ایک نئی شکل ہے جس کی اختراع کا سہرا معین قریشی کے سر جاتا ہے۔ مہمان خصوصی عبدالحسیب خان کہا کہ طنز و مزاح میں معین قریشی کا اپنا ہی انوکھا اسلوب ہے جو انھیں جداگانہ مقام دیتا ہے، ان کے ہر مضمون کا ناک نقشہ اور طور طریقہ دوسرے سے اتنا ہی مختلف ہوتا ہے جتنا کسی مزاح نگار کا ہونا چاہیے۔ ''خود خوش حملہ'' ان کے مزاحیہ ادب میں اچھا اضافہ ہے۔ مہمان اعزازی میاں زاہد حسین نے کہا کہ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے مزاح نگاری میں جدید اور قدیم کالم نگاری میں اپنی واضح شناخت بنائی ہے، وہ اپنے منفرد اسلوب کے سبب دور جدید میں اہم مراح نگار ہیں۔ رضوان صدیقی نے کہا کہ ایس ایم معین قریشی عملی انسان ہیں وہ بہت محتاط اور ذہین مزاح نگار ہیں۔ کالم نویس اور براڈ کاسٹر عظیم سرور نے کہا کہ معین قریشی اپنے منفرد انداز نگارش کے سبب پسندیدگی اور بے حد مقبولیت کے حامل مزاح نگار ہیں۔

(روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

قسیم واسطی کے اعزاز میں تقریب

ممتاز شاعر پروفیسر منظر ایوبی نے کہا ہے کہ کراچی ایک ایسا ادبی اور ثقافتی مرکز ہے جو ہر آنے والے مہمان کا پرجوش انداز میں استقبال کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے حلقہ فکر جدید کراچی کی جانب سے امریکا میں مقیم پاکستان کے معروف شاعر قسیم واسطی کے اعزاز میں منعقدہ محفل مشاعرہ کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قسیم واسطی ایک انسان دوست شاعر ہیں، ان کی شاعری میں قدیم رنگ نمایاں ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر بڑی قوت سے ملتا ہے، بلاشبہ قسیم واسطی ایک خلیق اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ قبل ازیں حلقہ فکر جدید کے روح رواں اقبال مجیدی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس مشاعرے میں صاحب صدر اور مہمان اعزازی کے علاوہ جن شعرا نے کلام پیش کیا ان میں رفیع الدین راز، جاوید منظر، ڈاکٹر شاداب احسانی، شارق بلیاوی، محمود ساگر، فہیم شناس کاظمی، قیصر وجدی، سہیل اختر ہاشمی، ابن عظیم فاطمی اور اقبال مجیدی شامل ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

صبا اکبر آبادی کی مرثیہ نگاری پر گفتگو

صبا اکبر آبادی عہد حاضر کے سب سے بڑے مرثیہ نگار ہیں، ان کی شاعری محبت اور اعلیٰ دائمی اصولوں سے عبارت ہے، انھوں نے اس عظیم صنف سخن سے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ماہر تعلیم مسرت خان نیازی نے بزم صبائے ادب پاکستان اور ینگ کلچرل ویلفیئر سوسائٹی کے اشتراک سے محمود آباد میں ''صبا اکبر آبادی کی مرثیہ

نگاری اور اتحاد بین المسلمین'' کے موضوع پر منعقدہ ادبی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ صدارت عارف شیخ عارف نے کی۔ پروفیسر ارشاد محمد، پروفیسر عزیز الرحمٰن صادق، ڈاکٹر محمد ایوب عباسی، پروفیسر اسما عباسی اور قاری محمد ادریس خان نے بھی موضوع پر گفتگو کی۔ عارف شیخ عارف نے کہا کہ صبا اکبر آبادی کی مرثیہ نگاری پر ہونے والا یہ ادبی اجتماع اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہم سب سچائی کے پرستار ہیں اور یہی پیغام صبا صاحب کے مرثیوں میں جگمگاتا نظر آتا ہے۔ پروفیسر اسما عباسی نے کہا کہ صبا صاحب کا مرثیہ تین اجزا سے عبارت ہے، ظلم کے خلاف اعلان جنگ، معاشرے میں قیام عدل کی سعی اور فرد کی زندگی میں ایثار و قربانی کا رویہ۔ انھوں نے کہا کہ نعتیہ شاعری بھرپور انداز میں ان کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ایوب عباسی نے کہا کہ صبا اکبر آبادی کا مرثیہ ذات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے عشق کا آئینہ دار ہے۔ قاری محمد ادریس خان نے کہا کہ صبا اکبر آبادی اتحاد بین المسلمین کے لیے مرثیہ نگاری کو ایک موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ آخر میں ان کے صاحب زادے ممتاز شاعر تاجدار عادل کی آواز میں ریکارڈ کردہ مرثیہ شرکا کو سنوایا گیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

بزرگ شاعر نظر امروہوی کے اعزاز میں تقریب

ممتاز طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ نظر امروہوی شاعری میں توانا لب و لہجے کے مالک ہیں ان کی شاعری میں رنگ تغزل نمایاں ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے کراچی کلب میں ممتاز بزرگ شاعر، نظر امروہوی کے اعزاز میں منعقد تقریب پذیرائی کے موقع پر اپنے خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ پہلی تقریب ہے جس کا کوئی صدر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ نظر امروہوی عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ان کی شاعری مردوں سے زیادہ خواتین میں مقبول ہے۔ ممتاز شاعر، راغب مراد آبادی نے کہا کہ نظر امروہوی، جگر مراد آبادی کی روایت کے آخری شاعر ہیں وہ غزل کی کلاسیکی روایت کے بھی ترجمان ہیں ان کا ترنم بھی انتہائی متاثر کن ہے انھوں نے کہا کہ جگر اور نظر میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں نے کبھی لکھی ہوئی غزل نہیں پڑھی۔ اپنی اپنی غزلیں زبانی یاد ہیں۔ ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ نظر امروہوی نے اپنی تہذیبی اقدار کو تمام زندگی عزیز رکھا، وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انھوں نے غزل کی ترویج و ترقی کے لیے بڑا کام کیا ہے انھوں نے غزل انٹرنیشنل کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ نظر امروہوی، مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں ان کے دو شعری مجموعے ''متاعِ نظر'' اور ''شعاعِ نظر'' شائع ہو چکے ہیں، ممتاز ادیب، شکیل عادل زادہ نے کہا کہ نظر امروہوی کی شاعری میں تخلیقی آگہی موجود ہے۔ انھوں نے تمام زندگی سخن سرائی کی۔ انھوں نے ایسی شاعری کی ہے جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ انھوں نے کہا کہ نظر امروہوی نے غزل کی کلاسیکی روایت کو تابندگی عطا کی۔ وہ پیرانہ سال کے باوجود آج بھی تر و تازہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس موقع پر انور مقصود اور انجم ایاز نے بھی خطاب کیا عارف باحلیم نے نظامت کے فرائض انجام دیے، نظر امروہوی نے اپنے مخصوص انداز میں کئی غزلیں پیش کیں۔ آخر میں معروف گلوکار، استاد سلامت علی نے نظر امروہوی کی غزلیں ساز و آواز کے ساتھ پیش کیں۔

(روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی خدمات

از

شہاب الدین ثاقب

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مفصل حیات اور زبان و ادب کے سلسلے میں کی
جانے والی ادبی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

شہاب الدین ثاقب نے اس وقیع کام کو پوری تندھی سے سرانجام دیتے ہوئے بابائے اردو کا نہ صرف مرقع پیش کیا ہے بلکہ اُن کی علمی و ادبی خدمات کو ایک جامع حیثیت میں بھی مرتب کیا ہے۔

بابائے اردو شناسی میں یہ کتاب اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بیاضِ مراثی

اشاعت دوم

گیارہویں، بارہویں صدی ہجری کے مراثی کا مجموعہ

مرتب: افسر صدیقی امروہوی

صفحات: ۲۷۰ قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270 Phone: 4811406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

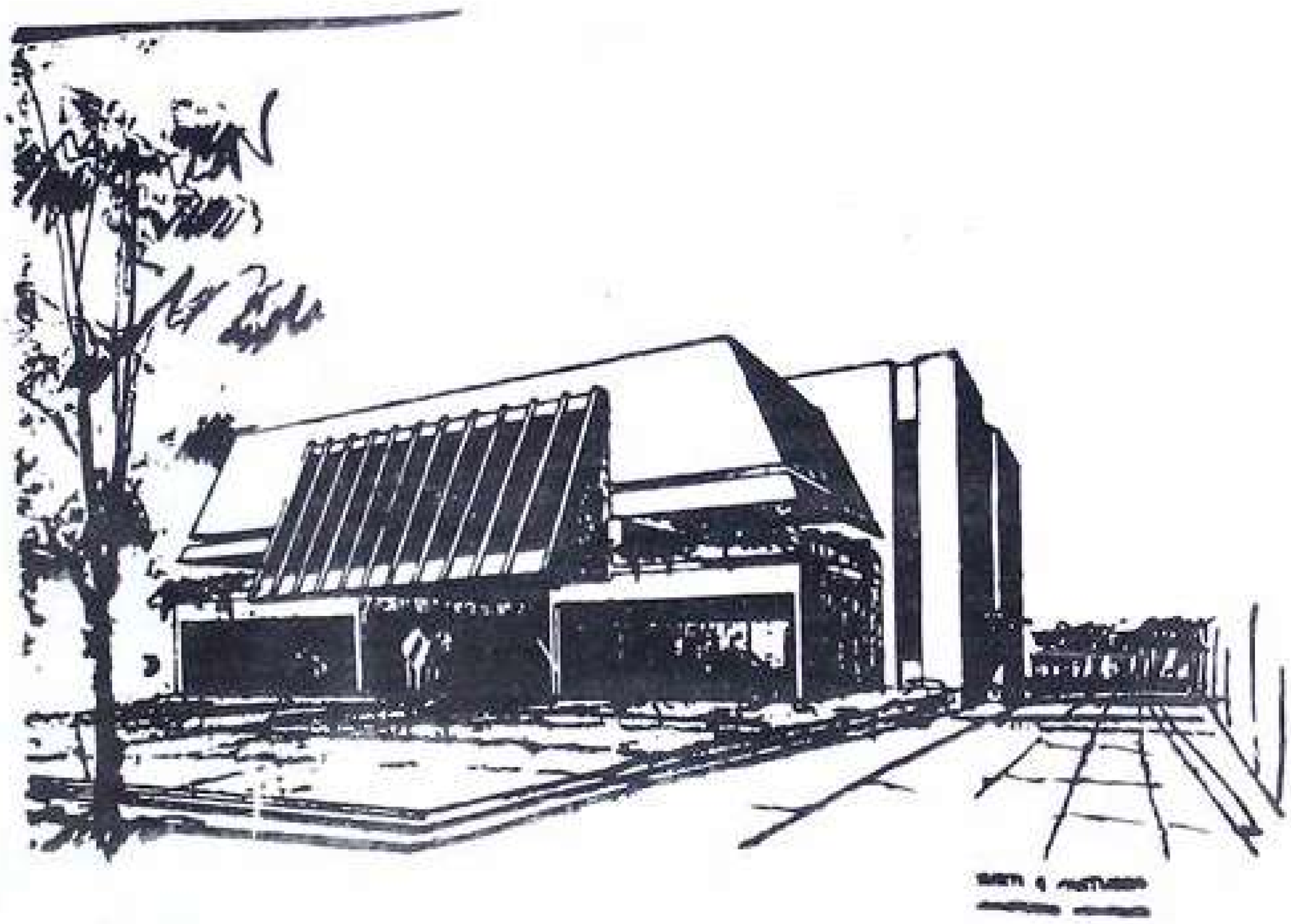

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

ڈاکٹر ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، نے انجمن ترقی اردو پاکستان (ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی) کے لیے احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی سے شائع کیا۔